Dr shyama parsad mukharjee university,Ranchi

B.A Sem-06

Sub-Urdu, Paper-13

درج ذیل معروضی سوالات کا جواب دیجیے۔

(i) اصلاح زبان کی تحریک سے کس شاعر کا تعلق نہیں تھا؟

(الف) مرزا مظہر (ب) ناسخ (ج) مضمون

(ii) ان میں کس کا تعلق ایہام گوئی سے نہیں تھا؟

(الف) آبرو (ب) یک رنگ (ج) ناسخ

(iii) رومانی تحریک کی ابتدا کب ہوئی؟

(الف) انیسویں صدی کے آخر میں (ب) بیسویں صدی کے آخر (ج) اٹھارہویں صدی کی ابتدا

(iv) رومانوی تحریک کے نقاد کی نشان دہی کیجیے؟

(الف) احتشام حسین (ب) فاروقی (ج) حسین آزاد

(v) مابعد جدید ناول نگار کون ہیں؟

(الف) عصمت (ب) الیاس احمد گدی (ج) بیدی

(vi) جدیدیت کا رجحان کب عمل میں آیا؟

(الف) 1900ء (ب) 1936ء (ج) 1960ء

(vii) حلقہ ارباب ذوق کا قیام کب عمل میں آیا؟

(الف) 1936ء (ب) 1932ء (ج) 1939ء

(viii) ترقی پسند تحریک کا پہلا کانفرنس کب منعقد ہوا؟

(الف) 1936ء (ب) 1932ء (ج) 1938ء

(ix) فورٹ ولیم کالج کب قائم کیا گیا؟

(الف) 1900ء (ب) 1800ء (ج) 1857ء

(x) تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر کا نام کیا تھا؟

(الف) محمد علی جوہر (ب) ابوالکلام آزاد (ج) سرسید احمد خان

subjective

(2) فورٹ ولیم کالج سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجیے۔

(3) فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات پر ایک نوٹ لکھیے۔

(4) اصلاح زبان کی تحریک پر ایک نوٹ لکھیے۔

(5) ایہام گوئی کی تحریک پر روشنی ڈالیے۔

(6) علی گڑھ تحریک پر ایک مقالہ لکھیے۔

(7) اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

(8) ترقی پسند تحریک کے آغاز و ارتقا پر ایک نوٹ لکھیے۔

(9) حلقہ ارباب ذوق کے اہم رجحانات تحریر کیجیے۔

84% 3:32 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

باب سوم

اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کی لسانی تحریکیں

۱- ایہام کی تحریک

ولی دکنی کی تجدد پسندی نے اُردو زبان کو جو نئی کروٹ دی تھی اس سے دلی میں اُردو شاعری کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ چنانچہ جب اُردو زبان کا ادبی عروج شروع ہوا تو اس کے خلاف ردِ عمل بڑے مضحک انداز میں ادبی محفلوں اور مشاعروں[1] سے ابھرنے لگا۔ فارسی شعراء نے ریختہ گو شعراء کے متعلق اہانت آمیز باتیں کہنا شروع کر دیں اور میر جعفر زٹلی نے اس زبان کا مضحک زاویہ پیش کر کے اس کی قدر و قیمت کم کرنے کی کوشش کی۔ فارسی شعراء کے متذکرہ بالا منفی رویے کے خلاف اوّلین ردِ عمل خانِ آرزو کے ہاں پیدا ہوا اور انہوں نے فارسی کو ترک کر کے ریختہ کے مشاعرے کرانا شروع کر دیئے۔ ان مشاعروں میں جب اُردو کو فارسی کا مقابلہ مجلسی سطح پر کرنا پڑا تو لامحالہ اظہار نے مشکل گوئی کا وہ طریق اختراع کیا جس سے کہنہ مشق خلاق اور قادر الکلام شعراء ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ایہام کا فروغ جس نے ذو معنی الفاظ کے فنکارانہ استعمال سے شعراء کو نئی ذہنی ورزش کا وسیلہ مہیا کر دیا اسی کوشش کا ثمر نظر آتا ہے اور محمد شاہی عہد میں اسے اتنا فروغ حاصل ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اسے ایک باقاعدہ تحریک کی صورت مل گئی اور اسے ریختہ کی ہی ایک قسم قرار دے دیا گیا[2] چنانچہ میر تقی میر نے جہاں ریختہ کی دوسری قسمیں گنوائی ہیں وہاں ایہام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :-

Scanned with CamScanner

84% 3:32 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

"پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف دریں فن رواج داشتہ"[1]

ولی کی تحریک نے زبان کو جس نئے اسلوب سے آشنا کیا تھا وہ رومانی عناصر کی فراوانی کے باوجود ابھی تک کھردرا تھا۔ چونکہ ولی کے ہاں نامانوس الفاظ کا خاصہ بڑا انبار موجود ہے، اس لئے ولی کے اس اجتہاد کو توازن اور اعتدال کی راہ پر ڈالنے کی ضرورت موجود تھی۔ زبان کی ان ضرورتوں کو ولی کے شعراء نے پورا کیا اور نئی اردو کو جھاڑ جھنکار سے صاف کرنے اور فنی صنعتوں سے روشناس کرانے کا فریضہ سرانجام دیا۔ اس زاویے سے دیکھئے تو ایہام کی تحریک کلاسیکی نوعیت کی ہے اور ولی کی توانا تحریک کے بعد اس کا فروغ ایک فطری واقعہ نظر آتا ہے۔

ایہام روایتِ لفظی کے ایک مخصوص انداز کا نام ہے اور اس کا تمام تر دار و مدار ذو معنی الفاظ کے فنکارانہ استعمال پر ہے۔ تخلیقی شاعری دانست میں لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہے اور وہ لفظ کے بعض معانی کو پوشیدہ رکھنے اور مخفی معنی کو لفظ کے خارجی خول سے چمکانے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ چنانچہ اردو کے ابتدائی دور میں جب اس زبان کا سامنا فارسی زبان سے ہوا تو شعراء نے اردو کا تمول اور قدرتِ بیان ظاہر کرنے کے لئے لفظ کو نئے نئے قرینوں سے استعمال کرنے کی کاوش کی اور ایہام کو فروغ دیا۔ محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو میں ایہام کو ہندی دوہوں کی اساس پر فروغ حاصل ہوا۔[2] آزاد کا یہ خیال اس حقیقت پر مبنی نظر آتا ہے کہ سنسکرت میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی موجود ہیں۔ سنسکرت میں اس صنعت کا نام شلش ہے۔ اور اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ اوّل سبھنگ جس میں لفظ سالم رہتا ہے۔ دوم۔ ابھنگ جس میں لفظ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہ صنعت پیدا کی جاتی ہے۔ مولوی عبدالحق نے آزاد کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ "اردو ایہام پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر

---

[1] مولوی عبدالحق۔ اردو شاعری میں ایہام گوئی۔ ماہنامہ "ہم قلم" کراچی۔ جون ۱۹۶۱ء ص ۹

[2] محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات۔ ص ۸۰

Scanned with CamScanner

3:33 PM 84%
ps://www.rekhta.org/eb

ہوا اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی ہے۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ ایہام کی صنعت فارسی ادب میں بھی موجود ہے۔ تاہم اس زبان میں صنائع اور بدائع کلام کا حسن بڑھانے کے لئے زیادہ فطری انداز میں استعمال ہوتے ہیں اور فارسی شعراء نے ان کا استعمال اس احتیاط سے کیا کہ طبیعت پر گراں نہ گزرے۔ چنانچہ محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ "فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔"[2] ہندی دوہے میں لفظ کے پوشیدہ مفہوم کو سامع کے باطن میں اتارنے کا رجحان نمایاں ہے۔ اس لئے اُردو میں ایہام کی تحریک ہندی اثرات کا نتیجہ ہے اور یہ اس ردِ عمل کا ہی ایک سلسلہ نظر آتا ہے جو فارسی کے خلاف ملک میں پرورش پا رہا تھا اور بالواسطہ طور پر اُردو کے فروغ کا باعث بن رہا تھا۔

ایہام کو خانِ آرزو اور بالخصوص ان کے شاگردوں نے فراوانی سے استعمال کیا۔ خانِ آرزو کا ایقان تھا کہ مستقبل میں فارسی کے بجائے ریختہ ہی اس ملک کی زبان بننے والی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فارسی سے توجہ ہٹا کر اُردو کو متمول بنانے پر توجہ دینا شروع کی اور کئی شعراء کو فارسی کے بجائے اُردو میں شعر کہنے پر مائل کیا۔[3] اُردو شاعری میں صنعتوں کا فروغ اسی کاوش کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ ایہام کی تحریک کو پروان چڑھانے میں خانِ آرزو کا عمل دخل بھی موجود تھا اور یہ تحریک ہندوستان کے ارضی اور ایران کے آسمانی عناصر کے تصادم کا نتیجہ تھی۔ ایرانی تہذیب کا آفتاب چونکہ اپنی تمازت ختم کر چکا تھا۔ اس لئے اس تحریک کو مقبولیت حاصل کرنے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔

ہندوستان میں بول چال کی عام زبان میں ہندی کا چلن چونکہ پہلے شروع ہو

---

[1] مولوی عبدالحق۔ اردو شاعری میں ایہام گوئی۔ "ہم قلم" کراچی۔ جون ۱۹۶۱ء۔ ص ۹

[2] محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات۔ ص ۸۰

[3] اس قسم کے شعراء میں میرزا سوداؔ کا شمار بھی ہوتا ہے۔ آبِ حیات۔ ص ۱۴۹

Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

اردو ادب کی تحریکیں

چکا تھا۔ اس لئے یہ دریافت کرنا ممکن نہیں کہ ایہام کی ابتدا کس زمانے میں ہوئی۔ تاہم یہ واضح ہے کہ فارسی زبان کے بعض مستند شعراء کے ہاں بھی ہندی الفاظ استعمال کرنے کا رجحان موجود تھا۔ مثال کے طور پر میر عبدالجلیل بلگرامی نے فرخ سیر کی شادی پر جو مثنوی لکھی اس میں ہندی راگنیوں کو صنعتِ ایہام میں استعمال کیا گیا ہے۔

ز شوق ایں نوا ہائے دل آرا — کہ گل آمد وشد خاک دارا — کدارا۔ ابھنگ
لبِ ہر ساز ایں معنی ادا کرد — کہ جشن شاہ کام مارو اکرد — مارو۔ بہنگ

ہندی میں عبدالرحیم خانخاناں نے اس صنعت کو خوبی سے استعمال کیا ہے۔

جیوں رحیم گتی دیپ کی کل سپوت گتی سوئے
بارے اجیارو کرے بڑھے اندھیرو ہوئے [1]

مندرجہ ذیل دوہے میں لفظوں کی دو رنگی کیفیت پر جس حیرت کا اظہار کیا گیا ہے اس سے بھی صنعتِ ایہام کی معنویت کا اظہار ہوتا ہے۔

رنگی کو نارنگی کہیں بنے دودھ کا کھویا
چلتی کو گاڑی کہیں دیکھ کبیرا رویا

اردو میں فضلی اورنگ آبادی کی شاعری میں ایہام کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ولی نے شاعری میں رعایتِ لفظی سے ایہام کا جلوہ بھی پیدا کیا ہے اور وہ چونکہ اس دور کے میر مجلس تھے اس لئے انہوں نے ایہام سے جتنا کام لیا وہی ان کے معاصر اور قریب العہد شعراء کے لئے مثال بن گیا۔ چنانچہ ایہام میں ولی کا انداز زیادہ فطری نظر آتا ہے بلکہ اس میں بے ساختگی کا عنصر بھی موجود ہے۔

خودی سے اولاً خالی ہوئے دل — اگر اس شمع روشن کی لگن ہے
موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشا — اس کو پہاڑ ہووے پھر طور کا تماشا

---

[1] یہاں بارا کا لفظ ذومعنی ہے۔ ایک معنی بچپن اور دوسرا جلانا ہے۔ اسی طرح بڑھنا کے بھی دو معنی ہیں۔ یعنی بچے کا بڑھنا اور چراغ کا بڑھنا۔

Scanned with CamScanner

3:33 PM 84%
ps://www.rekhta.org/eb

ولی کی شاعری کو ملک بھر میں جو مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کا تتبع بڑے پیمانے پر ہوا۔ چنانچہ ولی کے تلامذہ میں سے شیخ شاہ محمد رضی اور اشرف اور ان کے معنوی تلامذہ، سراج، داؤد اور عزلت وغیرہ نے دکن میں ایہام کو اپنا شعار بنایا اور دلی میں خان آرزو کے شاگردوں میں سے شاہ مبارک آبرو، مضمون اور یک رنگ نے اسی کو شاعری کا معیار قرار دے دیا۔ اور اس صنعت سخن کے فروغ کا سہرا مضمون نے اپنے سر باندھ لیا۔

ہوا ہے جگ میں مضموں شہرہ اپنا　　طرح ایہام کی جب سیں نکالی[1]

تاہم ولی کے ہاں چونکہ ایہام کے اولین نقوش واضح اور فطری انداز میں ملتے ہیں اس لئے ولی کو ہی ایہام کی تحریک کا نقطۂ آغاز قرار دینا مناسب ہے۔

بلاشبہ تحریک ایہام کے اجراء میں فارسی اور ریختہ کے رد عمل اور مشاعرے کی فضاء کو بہت اہمیت حاصل ہے تاہم اس تحریک کے فروغ میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی عوامل کا عمل دخل بھی نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ ایہام کی تحریک کا رنگ محمد شاہی عہد کے آغاز میں بار ور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ نادر شاہ کے حملے نے اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ فرد اجتماعی خوف سے دوچار ہوا۔ اور عیش و طرب کی محفلوں پر افسردگی طاری ہو گئی۔ چنانچہ لفظ جو مستقیم اظہار کا وسیلہ تھا اپنی معنویت کھو بیٹھا۔ اور ایسے الفاظ جن سے بیک وقت دو یا دو سے زیادہ معنی نکل سکتے تھے عام استعمال ہونے لگے۔ اس کا تاریخی ثبوت اس واقعے سے بھی ملتا ہے کہ ۱۷۳۳ء میں جب نواب خان دوران خان میر بخشی مرہٹوں سے شکست کھا کر واپس آئے تو نواب عمدۃ الملک امیر خان نے برجستہ یہ جملہ کہا: "نواب آئے، ہمارے بھاگ آئے"[2] اس میں "بھاگ" کا لفظ فرار اور قسمت دونوں معانی کی نشاندہی کرتا ہے اور عمدۃ الملک کے مافی الضمیر

---

[1] "گلشن گفتار" کے مصنف نے بھی مضمون کے متعلق لکھا ہے کہ "موجد ایہام ریختہ اوست"
[2] بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ ساتویں جلد۔ ص ۹۰

Scanned with CamScanner

Vo)) LTE LTE 84% 3:33 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

کا پردہ پوش بھی ہے۔ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہے کہ اوّلاً مغلوں کی درباری سازشوں اور ثانیاً نادر شاہ کے حملے سے پھیلنے والے خوف نے عامۃ الناس کو ذومعنی الفاظ کے استعمال پر مائل کیا اور وہ مجلسی طور پر بھی پوشیدہ معانی کے حوالے سے گفتگو کرنے لگے۔

سلطنتِ مغلیہ کے آخری دور میں تلواریں کند اور الفاظ تیز ہوگئے تھے۔ چنانچہ وہ امور جو صرف قوتِ بازو سے سرانجام پا سکتے تھے، اب زبان کی مدد سے ادا ہونے لگے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب رزم کا میدان بزم میں آراستہ ہوا تو گفتار کے جو غازی شہرتِ عام سے سرفراز ہوئے ان میں زیادہ تعداد سپاہی پیشہ لوگوں کی تھی۔ شیخ نجم الدین مبارک آبرو ایک عرصے تک شاہی ملازمت سے وابستہ رہے[1] شیخ شرف الدین مضمون کا اصل پیشہ سپاہ گری تھا اور بقول آزاد تباہیِ سلطنت سے ہتھیار کھول کر مضمون باندھنے پر قناعت کرلی[2] شاکر ناجی نادری چڑھائی اور محمد شاہی لشکر کی تباہی میں شامل تھے[3] شاہ حاتم سپاہی پیشہ تھے۔ اور انہوں نے اس بات پر فخر کا اظہار کیا کہ ان کے فن کے قدردان سپاہی ہیں۔

اب قدرداں کہاں حاتم دیکھ   عاشق و شاعر و سپاہی ہے

چنانچہ جب پیشۂ سپاہ گری باعثِ عزت نہ رہا تو سپاہیوں نے اپنے جوہر شجاعت کے میدان میں آزمائے اور لفظوں سے تیغ آزمائی شروع کردی۔ ایہام کی تحریک میں سپاہیانہ جوہر کی اس عطا کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ اکثر سپاہیانہ اصطلاحات اور استعارات کو بھی ایہام میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی:

خلق یک رنگ کی ہوئی دشمن   جب سے تیر وہ دوستدار ہوا   یکرنگ

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ ساتویں جلد ص ۲۰

[2] محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات۔ ص ۱۰۱

[3] ایضاً ص ۱۰۵

190
684
Scanned with CamScanner

84% 3:33 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

ہر یک نگہہ میں ہم سے کرنے لگے ہو نوکیں کچھ یوں تری آنکھوں نے پکڑا ہے طور بانکا
آبرو

تری نگہہ کی کثرت سے اے کمان ابرو ہمارے سینہ پہ تودہ ہوا ہے تیروں کا
شاکر ناجی

ایہام کے فروغ میں فطرت کے قانونِ تلافی کا بھی خاصہ عمل دخل نظر آتا ہے۔ مرہٹوں کی یلغار اور ابدالیوں کے حملے نے عوام الناس کو ذہنی بے چارگی سے ہی دوچار نہیں کیا تھا بلکہ جب پسہ گری پر زوال آیا، اور قوتِ بازو سے ناموری حاصل کرنے کے امکانات ختم ہو گئے تو وہ تمام فطری خامیاں جو شعراء میں موجود تھیں، نمایاں ہونے لگیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس دور میں ولی اور شاہ حاتم کے علاوہ کوئی صفِ اوّل کا شاعر نظر نہیں آتا۔ معدودے چند لوگ جو نمایاں ہوئے ان پر بھی خان آرزو سایہ فگن ہیں اور ان کے مرتبے کا تعین استاد کے ذکر کے بغیر نہیں ہو پاتا۔ دوسری طرف ان شعراء کی شخصیت پر نگہ پڑتی ہے تو ان کی بعض جسمانی خامیاں پہلے تو توجہ کھینچتی ہیں اور یہ شعراء کے مابین چشمک کا وسیلہ بھی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ مبارک آبرو ایک آنکھ سے معذور تھے، اور مظہر جانِ جاناں سے ان کی چشمک تھی[1]۔ شاکر ناجی آبلہ رو تھے مضمون کے دانت نرخرے کے سبب جھڑ گئے تھے اور خان آرزو انہیں از راہ مذاق "شاعرِ بے دانہ" کہا کرتے تھے۔ شاہ حاتم کلاہ پر دستار باندھتے اور ایک باریک چھڑی اور رومال ہاتھ میں رکھتے۔ یہ سب شعراء ماسوائے حاتم کے شاعری میں زیادہ نام نہ پا سکے لیکن تحریک ایہام کو پروان چڑھا کر خاصے مشہور ہو گئے اور آج بھی اس تحریک کی بدولت پہچانے جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہنا مناسب ہے کہ ان شعراء کی جسمانی خامی کی تلافی بلا واسطہ طور پر تحریک ایہام کے فروغ کا باعث بنی۔

اردو شاعری میں ایہام کی ابتدا ولی کے زمانے میں ہو چکی تھی۔ لیکن اسے فروغ ولی

---

[1] محمد حسین آزاد، آبِ حیات۔ ص ۹۷

Scanned with CamScanner

84% 3:33 PM
ps://www.rekhta.org/eb

میں حاصل ہوا۔ اس تحریک کے اولین شعراء میں شرف الدین مضمون کو اہمیت حاصل ہے۔ مضمون اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔ شاہجہان آباد آئے تو شعر میں اصلاح خان آرزو سے لی۔[1] چنانچہ استاد کے اثرات اور فیضِ صحبت سے ان کا کلام ایہام نما ہو گیا:

کرے ہے دار کو کال بھی سر آج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
اگر پاؤں تو مضموں کو کھوں ڈھونڈ کروں کیا جو نہیں لگتا مرے ہاتھ

شاہ مبارک آبرو اور شاکر ناجی کا شمار اول درجے کے شعراء میں نہیں ہوتا۔ تاہم ایہام گوئی میں ان دونوں نے بڑا نام پیدا کیا اور اب اس تحریک کے نامور شعراء میں شمار ہوتے ہیں:

کہا دم سانورے نیں آبرو کو دیکھ کر پانی
لگا برسات کا موسم پو کھو یارو چلی جا میں آبرو

رہتے ہو جیو میں مثر عو دلچسپ کی طرح
گھر بار ہووے سرو قداں کا برائے بیت آبرو

نہ تو کو یار کو کر خط رکھانا یا منڈاتا ہے
مرے نشہ کی خاطر لطف سے سبزی بناتا ہے شاکر ناجی

شاکر ناجی کی ایہام گوئی فکری آزمائش سے دوچار نظر آتی ہے اور تخلیقی لطافت نمایاں نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناجی کی ... مزاجی نے لفظ کی دھار تیز کر دی ہے اور اس کا ایہام مصنوعی نظر آتا ہے۔

مصطفیٰ خان یک رنگ آبرو اور ناجی کے معاصر تھے۔ اس لئے انہوں نے بھی ایہام کے اثرات قبول کئے اور اسے تحریک بنانے میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے ہاں دگی اور سہل الممتنع کی کیفیت موجود ہے۔

ہاتھ اٹھا جور اور جفا سے تو یہی گویا سلام ہے تیرا
لب شیریں سے تلخ کاموں کو بولنا تلخ کام ہے تیرا

---

[1] مرزا علی لطف۔ گلشن ہند۔ ص ۲۱۰

Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

اردو ادب کی تحریکیں

ایہام میں طبعِ رسا کے بجائے صناعی کا عنصر زیادہ ہے۔ اس لئے اس عہد کے وہ شعراء جن کا تخیل اونچی پرواز نہیں کر سکتا تھا ایہام سے ہی اپنی دکان سجاتے ہیں[1]۔ یہاں اس قسم کے چند شعراء کا حوالہ پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

یہی مضمون خط ہے احسن اللہ   کہ حسن خوبرویاں عارضی ہے   (احسن اللہ احسن)
ہے شباب کباب و فصلِ بہار   کوئی اس وقت میں پیالا دو   (داؤد اورنگ آبادی)
تیری انگیا میں کیا بلا کچھ ہے   جن نے دیکھا وہ ہاتھ ملتا ہے   (یکرنگ)
دخترِ رز کو کہہ کہ اس سے ملے   ورنہ عارف افیم کھاتا ہے   (عارف)

تحریکِ ایہام کا سب سے اہم شاعر جس نے ولی کے دیوان سے گہرا اثر لیا اور اس کے ساتھ معنوی تلمذ کا رشتہ قائم کیا[2] شیخ ظہور الدین حاتم ہے۔ شاہ حاتم، آبرو اور ناجی کا ہم عصر تھا اور اس کے سلسلۂ تلمذ میں سودا، عبدالحی تاباں، مرزا سلیمان شکوہ اور سعادت یار خاں رنگین جیسے قادر الکلام شعراء موجود تھے۔ شاہ حاتم نے کئی شعراء کا زمانہ اور تحریکِ ایہام کی ابتداء، عروج اور زوال کے ادوار دیکھے۔ چنانچہ وہ بھی ابتدائی دور میں روشِ زمانہ سے دامن نہ بچا سکے اور ایہام سے متاثر ہوئے۔ ان کے قدیم دیوان پر ایہام کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔

شمالِ بحر موجیں مارتا ہے   لیا ہے جس نے اس جگ کا کنارا   (حاتم)
ہے وہ چرخ سے شمالِ سرگرداں   جس کو حاتم تلاش مال ہوا   (حاتم)

نظر آوے ہے بکری سا کیا پر ذبح شہروں کو
نجانا میں کہ یہ قصاب کا رکھتا ہے دل گردا   (حاتم)

مندرجہ بالا امثال میں شعراء نے ایہام کو التزام سے استعمال کرنے کی شعوری کاوش

---

[1] مولوی عبدالحق۔ اردو شاعری میں ایہام گوئی۔ ماہنامہ "ہم قلم" کراچی۔ جون ١٩٦١ء ص ١٠
[2] ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ شاہ حاتم۔ ص ٤٩
[3] ایضاً۔ ص ٥١

193
684

Vo)) LTE LTE 1 84% 3:33 PM
ps://www.rekhta.org/eb

کی ہے اور شعر پر تک بندی کا انداز غالب نظر آتا ہے۔ چنانچہ جذبہ قوت پرواز سے عاری ہو کر ایہام کے لفظوں کے ساتھ چمٹ سا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب نئے ذو معنی الفاظ کی تلاش شروع ہوئی تو شاعری الہامی کیفیت سے عاری ہو گئی۔ اور اس پر تصنع غالب آگیا نتیجۃً بہت جلد اس کے خلاف ردِ عمل بھی شروع ہو گیا اور مرزا مظہر جانِ جاناں، انعام اللہ خاں یقین اور تحریک ایہام کے ایک نمائندہ شاعر شاہ حاتم نے ردِ ایہام کی تحریک شروع کر دی۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ تحریک ہنگامۂ ہاؤ ہو بپا کرنے کے بعد قریباً ختم ہو گئی۔ محمد شاہی عہد کے بعد آنے والے شعراء نے ایہام کو بطور صنعت استعمال کرنے کی کوشش کی لیکن یہ صرف زورِ بیان اور قوتِ اختراع کے اظہار کا ایک معمولی وسیلہ نظر آتی ہے اور زیادہ تر تفننِ طبع کے لئے ہی استعمال ہوئی۔ بطور تحریک ایہام پر محمد شاہ کے دور آخر میں زوال آگیا تھا چنانچہ خواجہ میر دردؔ، میر تقی میرؔ اور غالبؔ کے انوکھے اندازِ تخلیق نے شاعری کو نئی معنویت سے ہم کنار کیا تو ایہام گوئی ذہنی ورزش نظر آنے لگی اور پھر یہ بھی تحریک کی صورت اختیار نہ کر سکی۔

شاہ حاتمؔ، میرزا مظہر جانِ جاناں اور میرزا رفیع سوداؔ وغیرہ نے ایہام کی تحریک کے خلاف جس ردِ عمل کا اظہار اشعار میں کیا اس کے اثرات اتنے دور رس ہیں کہ اس تحریک کی بعض خوبیاں اور ادبی خدمات نظر سے اوجھل ہو گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریک ایہام نے صرف فارسی کے لسانی غلبے کے خلاف ہی بغاوت نہیں کی تھی بلکہ ریختہ کے پُر سکون مزاج کو بھی تحریک آشنا کیا اور زبان کے گنجینۂ مخفی سے نئے الفاظ کا ذخیرہ برآمد کر لیا۔ لفظوں کی اس تحقیق و جستجو کا مثبت نتیجہ خان آرزو کی لغت نگاری کی صورت میں سامنے آیا۔[لہ] تحریک ایہام معنی کے بجائے الفاظ کی تحریک تھی۔ چنانچہ اس تحریک میں جذبہ رفعت حاصل کرنے کے بجائے لفظوں کے ساتھ پیوست

لہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، ساتویں جلد۔ ص ۱۱

Scanned with CamScanner

84% 3:34 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

ہو جاتا اور معنی ڈھینے کے بجائے سطح کے ساتھ جامد ہو جاتے۔ چنانچہ اس تحریک نے نئی سرزمینوں کو فتح کرنے کے بجائے پرانی فتوحات کو ہی مستحکم کیا۔ اس لحاظ سے اس تحریک کا مزاج کلاسیکی ہے اور اس میں رومانیت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ اس تحریک نے فارسی کے درآمدی اثرات کو کم کرنے اور مقامی زبان کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ بیشتر ایہام گو شعراء کے ہاں محبوب کا جو تصور قبول عام کی صورت اختیار کرتا ہے اس کے لئے پیتم، من موہن، سجن وغیرہ کے الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں۔ اور اس کا رنگ سانولا اور ملیح ہے۔ شاعر اس محبوب کے ساتھ رومانی ربط نہیں رکھتا بلکہ اسے مٹھائی کا ٹکڑا سمجھتا ہے۔ اور اس سے اکتسابِ لذت ہی نہیں کرتا بلکہ اسے کھا جانے پر بھی آمادہ ہے اور یہ سب اس مادری تہذیب کے عناصر ہیں جن کا خمیر خالصتاً ہندوستانی مٹی سے اٹھا ہے۔ اس زاویے سے دیکھئے تو ایہام کی تحریک میں ارضی مزاج کی اہمیت زیادہ ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف جو ردِ عمل ہوا وہ آسمانی نوعیت کا تھا۔

(۴)
تحریک ایہام کا ردِ عمل — اصلاحِ زبان کی تحریک

محمد شاہی دور میں ریختہ کی شاعری کو قبولِ عام مل چکا تھا۔ اس دور میں ایہام کی تحریک بلبلے کی طرح اٹھی۔ ایک مختصر سے عرصے کے لئے رقصِ آب کا مظاہرہ کیا اور پھر ختم ہو گئی۔ اس تحریک کے بہت سے شعراء سپاہی پیشہ، داروغگانِ مطبخ اور ملازم تھے۔ چنانچہ ایہام کی تحریک فارسی کے بلند پایہ شعراء کی مخالفت میں نسبتاً کمتر درجے کے شعراء کی تحریک تھی۔ اس تحریک کے خلاف ردِ عمل میرزا مظہر جانِ جاناں جیسے شاعر نے ظاہر کیا۔ جو تیموری خاندان کا نواسہ تھا اور جس کے والد اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں صاحبِ منصب تھے۔ میرزا مظہر جانِ جاناں کا نسب باپ کی طرف سے محمد ابن حنفیہ سے ملتا ہے[۱] اس لحاظ سے ان کی رگوں میں عرب اور عجم دونوں کا خون دوڑ رہا تھا

[۱] محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات ص ۱۳۰

195
684
Scanned with CamScanner

3:34 PM 83%
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

اور اس میں ہندوستانی خون کی آمیزش نہیں ہوئی تھی۔ میرزا مظہر جانجاناں کی شخصیت کا دوسرا زاویہ تصوف سے پھوٹتا ہے۔ میرزا مظہر جانجاناں خود بھی صاحبِ طریقت تھے اور ان کا تعلق نقشبندی سلسلے کے ساتھ تھا۔ انہوں نے علم حدیث یا اصول پڑھا تھا اور حنفی مذہب کی شریعت کو صدقِ دل سے ادا کرتے تھے۔ میرزا مظہر جانجاناں کی سلامتیِ طبع اور لطافت کی بڑی شہرت ہے۔ چنانچہ ان کی نازک طبعی نے ایہام کو قبول نہ کیا اور اسے متروک قرار دے کر اپنے عہد کے شعراء کا طبقہ الگ کر دیا۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ ایہام کے تصنع کے خلاف میرزا مظہر جانجاناں نے مضبوط آواز اٹھائی تاہم اسے صرف ان کے لطیف مزاج کا ردِ عمل قرار دینا ممکن نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ردِ عمل کی نئی اصلاحی تحریک کے پس پشت کچھ دوسرے عوامل بھی کار فرما تھے اور ان میں زیادہ اہمیت اس تصادم کو حاصل ہے جو ہندی اور ایرانی تہذیبوں کے مابین برِ صغیر میں رونما ہو رہا تھا۔ مغلوں کا زوال درحقیقت عجمی تحریک کا زوال تھا اور مظہر جانجاناں کے سیاسی خیالات اتنے واضح ہیں کہ وہ اس زوال پر مسلسل نوحہ کناں نظر آتے ہیں۔

نہیں کچھ غم کہ یوں ملتا نہیں پیماں گسل میرا
کہ میں روتا ہوں دل کی بے کسی پر ہائے دل میرا

میرزا مظہر جانِ جاناں نے اردو زبان سے ہندی کے اثرات زائل کرنے اور فارسی کے غلبے کو قبول کرنے کی تحریک کی۔ اور یہ بالواسطہ طور پر ایرانی تہذیب کی پیشقدمی کی ہی ایک صورت تھی۔ اس لحاظ سے اصلاحِ زبان کی تحریک کا ایک پہلو سیاسی نوعیت بھی رکھتا ہے۔ اس تحریک میں میرزا مظہر کا عملی ساتھ انعام اللہ خاں یقین نے دیا۔ یقین ننھیال کی نسبت سے براہِ راست حضرت مجدد الف ثانی کے نواسے[2] تھے۔ چنانچہ مجددیت

---

[1] محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات ص ۱۴۱

[2] مرزا علی لطف۔ گلشن ہند۔ ص ۲۶۰

196
684
Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

ان کے خون میں بھی موجود تھی۔ جب میرزا مظہر جانِ جاناں نے اُردو کی تطہیر شروع کی تو یقین اُردو کو ہندی کے اثرات سے پاک کرنے میں اس لئے بھی زیادہ مستعد ثابت ہوئے کہ انہیں یہ فریضہ مذہبی بھی نظر آتا تھا۔ اس لحاظ سے اس تحریک کا ایک زاویہ مذہبی بھی ہے۔ چنانچہ یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ خواجہ میر درد نے ایہام کو لفظ دوئی قرار دیا اور دراصل یہ حقیقت ہونے کے لئے اسے مٹانا ضروری سمجھا۔[1]

ازبس کہ ہم نے حرف دوئی کا مٹا دیا — اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

اصلاحِ زبان کی تحریک کا مقصد ریختہ میں فارسی الفاظ، تراکیب اور صنعتوں کا استعمال تھا۔ چنانچہ نکات الشعراء میں میر تقی میر نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے اور اسی کو اپنا انداز شعر قرار دیا ہے۔

"فارسی کی محض وہ ترکیبیں لائی جائیں جو زبانِ ریختہ کے مناسب ہوں..... ایسی ترکیبیں کہ جو ریختہ کے لئے نامانوس ہوں معیوب ہیں۔ اس کا جاننا بھی سلیقہ شاعری پر موقوف ہے۔ میں نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر فارسی ترکیب گفتگوئے ریختہ کے مطابق ہو تو مضائقہ نہیں.....

..... چھٹی قسم وہ انداز شعر ہے جسے ہم نے اختیار کیا ہے۔ یہ انداز تمام صنعتوں مثلاً تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائی گفتگو، فصاحت، بلاغت، ادا بندیٔ خیال وغیرہ پر مشتمل ہے۔"[2]

دلی میں فارسی ادب کی روایت چونکہ ابھی زندہ تھی اس لئے فارسی آمیز اُردو کو مقبول ہونے میں کسی خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ بلکہ بہت جلد بیشتر وہ شعراء جو ایہام گوئی میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ اس نئی تحریک کے ہم نوا بن گئے۔ ان میں سب سے اہم شاہ حاتم تھے۔

---

[1] بحوالہ ابو الخیر کشفی۔ اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر۔ ص ۱۵۱

[2] میر تقی میر۔ نکات الشعراء۔ بحوالہ "دلی کا دبستانِ شاعری" مرتبہ نور الحسن ہاشمی۔ ص ۱۲۸

Scanned with CamScanner

83% 3:35 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

شاہ حاتم نے قدیم طرزِ سخن میں دیوان بھی مرتب کیا تھا اور ان کی اوّلین ناموری ایہام کی تحریک کی بدولت ہی ہے۔ شاہ حاتم کا اس نئی روش کو قبول کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جامد ذہن کے شاعر نہیں تھے اور انہوں نے اپنی آنکھیں مستقبل کی طرف بھی کھول رکھی تھیں۔ شاہ حاتم نے "دیوان زادہ" کے دیباچے میں اصلاحِ زبان کے لئے اصول وضع کئے اور متروکاتِ سخن کی ایک فہرست بھی مرتب کی۔ چنانچہ "دیوان زادہ" کے دیباچے کو اگر اس تحریک کا اوّلین تحریری منشور قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ شاہ حاتم لکھتے ہیں کہ:

"فقیر از معاصران شاہ مبارک آبروؔ و شرف الدین مضمونؔ و میرزا جانِ جاناں مظہرؔ و شیخ احسن اللہ و میر شاکر ناجی و غلام مصطفےٰ یک رنگ است۔ و لفظ در و بر و از و او کہ فعل و حرف باشد..... بندہ در دیوان قدیم خود تقید دارد و دریں ولا از دہ و دوازدہ سال اکثر الفاظ را از نظر انداختہ لسانِ عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد و روزمرہ دہلی کہ میرزایان ہند و فصیحان اند در محاورہ دارند منظور داشتہ زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آں را بھاکھا گویند موقوف کردہ۔ محض روزمرہ کہ عام فہم و خاص پسند بود اختیار نمودہ۔ شمہ ازاں الفاظ کہ تقید دارد بہ بیان می آرد۔

چنانچہ عربی و فارسی مثلاً تسبیح را تسبی و صحیح را صحی و بیگانہ را بگانہ و دیوانہ را دوانہ، و مانند آں بطور عامہ یا متحرک را ساکن و ساکن را متحرک۔ چنانچہ مَرَض را مَرْض، و غَرَض را غَرْض و مانند آں یا الفاظ ہندی کہ نین و جگ و نت، و بر و غیرہ، آنچہ باشد یا لفظ مارو مُوا و ازیں قبیل کہ بر خود قباحت لازم آید۔ یا بجائے ستی (یا سیتی) یا "ادھر" را اودھر و کدھر را کیدھر کہ در آں زیادتی حرف باشد یا بجائے پر "پہ" یا یہاں را یاں و وہاں را واں و ہر ایک را ہریک کہ در مخرج تنگ بود۔

Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

یا کسر و فتح و ضم در قافیہ یا قافیہ راءِ فارسی بہ راءِ ہندی۔ چنانچہ گھوڑا و بورا و دھڑو سر و مانند آں مگر ہائے ہوز را بدل کردن بہ الف کہ از عام تا خاص در محاورہ دارند۔ بندہ دریں امر بمطابعت جمہور مجبور است۔ چنانچہ بندہ را بندا و پردہ را پردا، شرمندہ را شرمندا و آنچہ ازیں قبیل باشد۔ و ایں قاعدہ را تا کجا شرح دھد۔ غرض کہ خلافِ محاورہ و غیر مصطلح و غلطی روزمرہ و نقصان فصاحت را داخل نہ باشد۔۔۔۔۔۔[1]

شاہ حاتم کے ان خیالات سے زبان کے بدلتے ہوئے ڈھانچے اور اس کے قواعد و ضوابط سامنے آتے ہیں اور ان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس سے قبل ریختہ ایک لڈ خود رو کی طرح بڑھ رہی تھی اور اس پر مخصوص ادبی لہجے کے بجائے مقامی لہجہ غالب تھا۔ چنانچہ ایک علاقے کے ریختہ کو دوسرے علاقے کے ریختہ سے الگ کر کے دیکھنا اور ان کے امتیازی خطوط متعین کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ شاہ حاتم نے ملک بھر میں ایک ستھری ریختہ رائج کرنے اور زبان کو غیر مانوس الفاظ سے پاک صاف کرنے کی سعی کی اور متروک الفاظ اور ان کے متبادل مانوس الفاظ کی جو فہرست مرتب کی اس کی تلخیص حسب ذیل ہے:۔

قدیم مستعمل لفظ	نیا لفظ	قدیم مستعمل لفظ	نیا لفظ
انکھیاں	آنکھیں	جیو	جی
نین	چشم۔ آنکھ	سُرج	سُورج
جُھٹا	جھوٹا	آپس	اپس
ستی	سے	دیا	چراغ
مُکھ	مُنہ	سنسار	دنیا
درپن	آئینہ	اگے	آگے

[1] شاہ نور الدین حاتم۔ دیوان زادہ۔ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص ۳۷-۳۸

Scanned with CamScanner

83% 3:35 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

قدیم مستعمل لفظ	نیا لفظ	قدیم مستعمل لفظ	نیا لفظ
سون	سے	آنجھو	آنسو
بیجلی	بجلی	نزیک	نزدیک
کوئے	کوئی	مَن	دل
گال	رخسار	رَین	رات
ایتی	آتی	پنڈا	بدن

شاہ حاتم نے اصلاحِ زبان کے جو قواعد وضوابط مرتب کئے تھے ان پر خود بھی عمل کیا۔ میرزا مظہر جانِ جاناں، یقین، تاباں، سودا، خواجہ میر درد اور میر تقی میر نے اس تحریک کو مزید تقویت دی اور زبان کو اس انداز میں صیقل کیا کہ لفظ بے پر جذبے کو فنی گرفت میں لینے پر قادر ہوگیا۔ چنانچہ بیشتر شعراء کے ہاں اس تبدیلی کا شعوری احساس بھی موجود ہے۔

بطورِ ہزل کے ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش یہ ہے مجھے ہو نہ شعر میں ایہام (قائم چاندپوری)

اور انہیں یہ بھی احساس ہے کہ اصلاحِ زبان سے ریختہ کا معیار بلند تر ہوگیا ہے۔

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں میں اہلِ کمال
یہ سنگریزہ ہُوا ہے درِ عدن مجھ سے (سودا)

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختہ کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے (میر)

ریختہ پر فارسی زبان کے غلبے کی یہ خارجی شہادتیں تھیں۔ داخلی طور پر دیکھئے تو بیشتر لوگوں نے فارسی شعراء کی تقلید کی اور غزل کی عجمی روایت کو اُردو غزل کے مزاج میں سمو دیا۔ اس طرح ولی دکنی کے عہد میں فروغ پانے والا ارضی رجحان مائل بہ تجرید ہونے لگا۔ اس دور کا ایک اور اہم رجحان فارسی اشعار اور محاوروں کو اُردو میں ڈھالنے کی صورت میں اُبھرا۔ چنانچہ متعدد شعراء نے فارسی شعراء کی غزلوں

200
684
Scanned with CamScanner

83% 3:35 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

پر غزلیں لکھیں اور اس میں کئی طرح کا تصرف بھی کیا۔ چند ایک مثالیں درج ذیل ہیں:

اوّل: فارسی شعر کا اُردو میں ترجمہ

دیدہ ام دفترِ پیمانِ وفا حرف بحرف — نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست
(نظیری)

فہرست میں خوبانِ وفا کے پیارے — دیکھا تو کہیں اس میں ترا نام نہ تھا
(قائم چاندپوری)

دوم:- فارسی شعر میں آزادانہ تصرف۔

بوئے یارِ من ازیں دست وفا می آید — ساغر از دست بگیرید من از کار شدم
(نظیری)

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں
(سودا)

سوم: اُردو شعر میں فارسی کا پورا مصرعہ سمونے کی کاوش

سودا سے کہا میں کہ ترے شہر کو سُن کر — دیکھا جو تجھے آ کے تو اے بے سر و پا ہیچ
بولا کہ تجھے یاد ہے وہ مصرعِ بیدل — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ
(سودا)

چہارم: بحر اور قافیہ کی پابندی سے غزل کہنے کا انداز

آمد سحر کہ دیر و حرم رفت و رو کنند — تا بازم از نصیب چہ خون در سبو کنند
(نظیری)

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں — دل ہی نہیں رہا کہ جو کچھ آرزو کریں
(درد)

اس قسم کی مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ گلشن نے ولی دکنی کو فارسی کے بیکار مضامین کو ریختہ میں استعمال کرنے کا جو مشورہ دیا تھا اس پر عمل قائم، سودا، درد اور دوسرے شعراء نے بھی کیا۔ چنانچہ اس سے زبان کی اصلاحی کوششیں بار آور

201
684
Scanned with CamScanner

ہونے لگیں، اُردو زبان میں الفاظ کا بے شمار ذخیرہ جمع ہونے لگا اور اردو میں شعر کہنا نسبتاً آسان ہوگیا۔ چنانچہ میرؔ نے نکات الشعراء لکھی تو اس میں صرف ایک سو تین شعراء کا تذکرہ درج کیا گیا لیکن ربع صدی کے بعد جب میر حسنؔ نے تذکرہ مرتب کیا تو شعراء کی تعداد تین سو چار تک جا پہنچی اور اس کے بعد یہ تعداد اس تیز رفتاری سے بڑھی کہ شعراء کا شمار کرنا آسان نہ رہا۔

اصلاحِ زبان کی تحریک میں میرزا مظہر جانِ جاناں کو اوّلیت حاصل ہے۔ انہوں نے فارسی اور اُردو زبان کو ایک ہی تار سے بُننے کی کوشش کی اور اصلاحِ زبان کو مذہبی اور سیاسی فریضہ سمجھ کر سرانجام دیا۔ ان کی منفرد عطا یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے شاگردوں میں سے انعام اللہ خاں یقینؔ، میر باقر حزیںؔ، بیبت قلی خاں حسرتؔ، احسن اللہ خاں بیانؔ، محمد فقیہ دردمندؔ، شاہ قدرت اللہ قدرتؔ، اور لیساون لعل بیدارؔ کو نئی زبان میں شعر کہنے پر آمادہ کیا۔ مظہر جانِ جاناں چونکہ تصوّف کے ایک سلسلے سے بھی تعلق رکھتے تھے اور ان کے مریدوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لئے ان کے مجوزہ لسانی اسلوب کو مقبول ہونے میں دیر نہ لگی۔ یہی وجہ ہے کہ مظہر جانِ جاناں کو اُردو کے ان اوّلین معماروں میں شمار کیا جاتا ہے، جنہوں نے اس کے لسانی ڈھانچے کو سنوارا۔[1] یہ زبان اگرچہ اُردو کے دَورِ وسطیٰ سے تعلق رکھتی ہے، تاہم اس میں پختگی، آراستگی اور شائستگی پوری شان سے جلوہ گر ہے۔

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار
ہائے کچھ چلتا نہیں اور مفت جاتی ہے بہار

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے
ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

یہ بلبلوں کا صبا مشہدِ مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ
اس واسطے لگا ہوں چمن میں ہوا کے ساتھ

خواجہ میر دردؔ نے اصلاحِ زبان کی تحریک کو تصوّف کے آئینے میں دیکھا اور

[1] ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ آبِ حیات۔ فٹ نوٹ۔ ص ۱۰۹

Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

حرفِ دوئی کو مٹانے کے لئے خوش تر اور لطیف زبان فروغ دینے کی کوشش کی۔ دردؔ کی حیثیت ایک ایسے شاعر کی ہے جو شمعِ انجمن کی طرح ایک جگہ مسند آرا تھا لیکن اپنی روشنی دور تک بکھیر رہا تھا۔ ان کے ہاں لفظوں کے انتخاب میں شعوری کاوش نظر نہیں آتی بلکہ زیریں لبی کی کیفیت نے زبان کو دردمندی، روانی اور نغمگی عطا کر دی ہے:

ہم نے کس رات نالہ سر نہ کیا　　پر اسے آہ کچھ اثر نہ کیا
جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

کس کی یہ موجِ حسن ہوئی جلوہ گر کہ یوں
دریا میں جو حباب تھے آنکھیں چھپا چلے

خواجہ میر دردؔ کے تلامذہ میں سے حکیم ثناء اللہ فراقؔ، میر محمد اثرؔ اور میر محمد بیدارؔ کی زبان میں بھی سادگی اور درد مندی موجود ہے اور ان کی شائستگی بھی تہذیبی قدروں کی آئینہ دار ہے۔

دل تھا مستاکہ چشم پہ کرتا تری نگہ　　ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا
(ثناء اللہ فراقؔ)

تو ہی بہتر ہے آئینہ ہم سے　　ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں
(میر محمد اثرؔ)

بیدارؔ راہِ عشق کسی سے نہ طے ہوئی　　صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا
(میر بیدارؔ)

دردؔ کی سادگی اور پرکاری کے برعکس سوداؔ اختراع اور صنعت گری کا زاویہ ہے چنانچہ انہوں نے اردو شاعری میں ان گنت تراکیب کے استعمال سے اسے ایک طلسم خانہ فن بنا دیا۔ ہر چند سوداؔ کی یہ کاوش شعوری ہے تاہم انہوں نے اضافتوں کے استعمال سے نہ صرف ترکیب سازی کی بلکہ کفایت لفظی کے رجحان کو بھی فروغ دیا مثال کے طور پر مندرجہ ذیل مرکبات دیکھئے جنہیں سوداؔ نے غزل اور قصیدے میں پوری قادر الکلامی سے استعمال کیا۔

Scanned with CamScanner

WhatsApp
ps://www.rekhta.org/eb
9

گوشۂ ابرو۔ سرِ زخمِ دل۔ بلاکشِ محبت، مُرغِ قبلہ نما، خانہ بانداز چمن۔ گرفتہ دل، خفتگانِ خاک، مشقِ خرامِ ناز، فرشِ پا، اندازۂ طوفان طرازیِ مژۂ عاشقانِ بہ رنگِ بلبلِ تصور۔ برقِ خرمن، نالۂ شب گیر، معاشِ اہلِ چمن۔ نطقِ فصیح، طبعِ ناہنجار، طبعِ جبہ زادۂ سخن ور، ناطاقتیٔ شیب، صیادِ گل اندام، لبِ لعلِ بتاں، چشمِ پُر آب وغیرہ۔

سودا کو زبان پر اتنا عبور حاصل تھا کہ بعض اوقات ان کا پورا مصرع فارسی زبان کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے

گو کہ ہے زیرِ فلک پر ز تماشا عالم　　اپنی نظروں میں تو اے یارِ جہاں ایک تو ہے
طرۂ زلف شکلِ چنگلِ باز　　مرغِ دل پر مرے جھپٹتا ہے

چنانچہ سودا نے اس زبان کو اپنے زمانے میں ہی شوکت و جلال عطا کر دیا اور فارسی زبان کو اُردو کے خمیر میں اس طرح شامل کیا کہ بعض اوقات اُردو کا پرانا روپ پہچاننا بھی مشکل ہوگیا۔ سودا کے اس انداز کو ان کے شاگردوں نے بھی قبول کیا اور شوکت و جلالت پیدا کرنے کی سعی کی۔

ابھی چھوٹا ہے مو تو رشک کی زنجیر سے قمری
نہ پھر گوشِ دلِ دیوانہ تک آوازہ جو پہنچا　　(ہاشم)
تقریرِ سرگزشت نہ پوچھو کہ خامہ وار
آتا ہے گریہ ہر سرِ حرفِ بیان پر　　(مرزا عظیم بیگ عظیم)
اے ابرِ بہاری شبِ ہجراں ہے خبردار
دامن ترا مجھ آہ کے شعلے نے پکڑ کے　　(معین)

سودا اور ان کے تلامذہ تحریک اصلاحِ زبان کا خارجی زاویہ پیش کرتے ہیں یہ شعراء زیادہ تر شعر کو لفظ کے ظاہری جلال سے بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہیں سودا کی زبان اس کے مردانہ لہجے کی نمائندہ ہے۔ اُردو کا یہ مردانہ لہجہ مستقبل میں نہ صرف غالب اور اقبال کی زبان میں رونما ہوا بلکہ اس کے خلاف منفی ردِ عمل بھی پیدا

Scanned with CamScanner

83% 3:35 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

ہوا اور زبان کا نسائی انداز ریختی کی صورت میں سامنے آیا۔

اصلاحِ زبان کی تحریک میں اُردو زبان کا نیا وجود سودا کا مرہونِ منت ہے۔ لیکن اسے وجدان میر تقی میر نے عطا کیا۔ میر کی زبان داخلی طور پر ایک الگ مزاج رکھتی ہے اور اس کی ہیئت میں دلی کے تہذیبی نقوش اور عامۃ الناس کا لہجہ بھی شامل ہے۔ اور میر کا یہ دعویٰ کچھ غلط نہیں کہ "میرا کلام کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا۔ جب تک کہ وہ اس زبان سے واقف نہ ہو جو دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے۔[۱]

میر نے زبان کے خارجی ڈھانچے کو اس کی داخلی روح سے الگ نہیں کیا۔ نکات الشعراء میں انہوں نے ریختہ میں فارسی حروف اور افعال، غیر مانوس تراکیب اور نامناسب بندشوں کے استعمال کو قبیح قرار دیا ہے۔ لیکن فارسی کی ایسی تراکیب جو زبانِ ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں قبول کرنے کی کھلی اجازت دی ہے۔ واضح رہے کہ ترکیبوں کے انتخاب میں بھی میر نے کسی سنگلاخ طریق پر چلنے کے بجائے شاعر کے ذوقِ اعلیٰ کو راہنما تسلیم کیا۔ اور اس کی تخلیقی آزادی پر قدغن عائد نہیں کی۔ میر کے اس طرزِ عمل سے ایک ایسی زبان وجود میں آگئی جس پر میر کی ذاتی ٹکسال کی پختہ مہر ثبت تھی۔

میر نے سرکشیدہ اور جلالی زبان استعمال کرنے کے بجائے سجل، کومل، لطیف اور موسیقی آمیز زبان پیدا کی اور مفرد الفاظ کے پیوند سے تراکیب تراشیں جن سے میر کا شعر جگمگانے لگتا ہے۔ اس قسم کی تراکیب کی ایک مختصر فہرست پیش کرنا بے محل نہ ہوگا۔

صحرا صحرا وحشت، جہاں در جہاں غفلت، سخن مشتاق، یک بیابان، قادر سخن، خاک افتادہ، حلقہ درگوش، دلِ غفراں پناہ، شوق کشتہ، عاجز سخن، دنیا دنیا تہمت وغیرہ۔

میر نے ان ترکیبوں سے اپنے نیم مجذوبی اور مسافرت کی فقیرانہ صدا کو آپس میں ملا

---

[۱] - وحید الدین سلیم، افادات سلیم۔ ص ۱۱۔ لاہور۔ ت۔ ن

205
684
Scanned with CamScanner

83% 3:35 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

دیا ہے۔ چنانچہ سودا کی زبان مغلوں کے میدانِ حرب کا نقشہ پیش کرتی ہے لیکن میر کی زبان خانقاہ اور تکیے کی فضا کی مظہر ہے۔ اور یہ ارضی فتوحات حاصل کرنے کے بجائے دلوں کو تسخیر کرتی ہے۔

سخن مشتاق ہے عالم ہمارا　　بہت عالم کرے گا غم ہمارا
کہا میں نے گل کو ہے کتنا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

پھر زلف ہوا پیچاں لے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

میر کی زبان نے اردو گرامر کو بھی متاثر کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے صیرِ جراحت جان، سطح اور خلش وغیرہ کو مذکر، اور خواب، گلزار، حشر، مزار وغیرہ کو مؤنث باندھا۔ ندا کی حالت میں الفاظ کی جمع فارسی طریق کے مطابق لائی گئی۔ چنانچہ ہتان، ہم صفیران، بلبلاں، آوارگاں، موزوں طبعاں وغیرہ جیسوں الفاظ میر کے رنگِ خاص کے غماز ہیں۔ اسی طرح جمع مونث میں الف اور نون کے لاحقے کام میں لائے گئے اور افعال اور صفات کو بھی یوں جمع بنا لیا۔ بے وفائیاں۔ کج ادائیاں۔ زلفیں دکھائیاں، باتیں نہ مانیاں، وغیرہ۔ میر کی زبان میں مضاف اور مضاف الیہ کے درمیان سے حرفِ اضافت بھی حذف کر دیا جاتا ہے۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنہیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

میر کا یہ تصرف اس کے تخلیقی مزاج کا حصہ ہے اور اس رنگِ خاص سے عبارت ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے رنگِ میر کا عنوان دیا ہے۔

میر کے تخلیقی اصول بظاہر سادہ نظر آتے ہیں لیکن اس بے ساختہ کیفیت کو گرفت میں لینا آسان نہیں۔ چنانچہ میر جس درجہ کے اُستاد تھے اس درجہ کے شاگرد انہیں

Scanned with CamScanner

83% 3:35 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

نصیب نہیں ہوئے[1]۔ یہ زبان ایک خاص طرزِ زندگی کی مظہر ہے۔ اور جن لوگوں نے میر کا طرزِ زندگی قبول کیا انہوں نے اس کی زبان بھی اکتساب کی، ان میں فقیر عبدالرسول نثار، خانہ نشیں عبداللہ خاں مشتاق، درویش برہنہ مجنوں اور محمد محسن وغیرہ کا نام میر کے تلامذہ میں ملتا ہے اور انہوں نے زبان کے اسی زاویے کو فروغ دیا۔

ہاتھ سے ان جامہ زیبوں کے نکل جاویں گے ہم
یہ گریباں دامن صحرا کو دکھلاویں گے ہم (عبدالرسول نثار)

مگر ناقہ لیلےٰ چلا آتا ہے صحرا سے
صبا کس نے سنایا آج قیسِ خاک بر سر کو (عبداللہ خاں مشتاق)

حرف تیرے عقیق لب کا شوخ
زندہ کرتا ہے نام عیسےٰ کا (محمد محسن)

اردو زبان جو شاہ حاتم، مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے زمانے میں لسانی اصلاحات کے دور سے گزر رہی تھی جب میر اور سودا کے دور میں پہنچی تو ایک متمول زبان بن چکی تھی، یہ زبان مصحفی، جرأت اور جعفر علی حسرت کے دور میں آبادکاری کی منزل سے گزرنے لگی۔ اور اب اس کی آرائش اور سجاوٹ کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگی۔ محمد حسین آزاد نے اس عہد کا جو لسانی تجزیہ کیا ہے اس کے مطابق "یہ لوگ نہ ترقی کے قدم آگے بڑھائیں گے۔ نہ اگلی عمارتوں کو بلند اٹھائیں گے۔ ایک مکان کو دوسرے مکان سے سجائیں گے اور ہر شے کو رنگ بدل بدل کر دکھائیں گے، وہی پھول عطر میں بسائیں گے، کبھی ہار بنائیں گے، کبھی طرّے سجائیں گے"[2]

ان میں سے جرأت نے اساتذہ کے تسلیم شدہ راستے سے انحراف نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے جذبے کی جس سطح کو مس کیا اس نے زبان کا مزاج قائم رکھنے اور اس کی

---

[1] عبدالسلام ندوی۔ شعر الہند۔ ص ۱۰۸۔ لاہور ۱۹۶۵ء

[2] محمد حسین آزاد۔ آبِ حیات۔ ص ۲۲۹

Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

سماجی اہمیت اُبھارنے میں مدد دی۔ چنانچہ لفظ کو بہ تکرار استعمال کرنے اور غزل کو نسوانی لہجہ عطا کرنے میں جرأت کی معاملہ بندی نے بھی معاونت کی ہے۔

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں — ہے ہے خدا کے واسطے مت کر نہیں نہیں

ہم بھی اس باغِ جہاں میں شب کی مہمان ہیں
مثلِ شبنم صبح کو گریہ کناں اُٹھ جائیں گے

جعفر علی حسرت کی شاعری زبان کا کوئی نیا اصلاحی زاویہ پیش نہیں کرتی بلکہ یہ صرف حسرت کے مافی الضمیر کا سادہ اظہار ہے۔

آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو — تو ہی لے جائیو سر پر یہ گلستاں اپنا

میر حسن زبان کی پاکیزگی اور شائستگی کی مثال ہے[1]۔ انہوں نے روزمرہ کے مجلسی لہجے کو زبان کے ادبی لہجے سے ہم آہنگ کر دیا۔ چنانچہ ان کے ہاں دِلّی کی شائستگی اور لکھنؤ کی تہذیبی رفعت دونوں ہم زبان ہو گئے اور یوں زندگی کا اجتماعی تجربہ محاورے میں ڈھل گیا۔

دامنِ صحرا سے اُٹھنے کو حسن کا جی نہیں — پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر
نازِ عشوے سے غمزے سے نگہ لیتے ہیں — وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

مصحفی نے رائج الوقت محاورے کے مطابق زبان کے حسن کو اجاگر کیا اور لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم شمار کیا۔ چنانچہ مصحفی نے ان گنت الفاظ کے تراشیدۃ استعمال سے دبستانِ لکھنؤ کی اس زبان کو فروغ دیا جو تکلف، تصنع، ضلع جگت اور ایہام سے پاک ہے[2]۔ اور لفظ کی اکہری پرت کو بھی یوں اثاثی ہے کہ قاری اس سے لذت اور سرور اکتساب کر لیتا ہے۔

اک تو تھا آتشِ سوزاں بدنِ شوخ ترا — شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہنِ سرخ ترا

---

[1] غلام ہمدانی مصحفی — تذکرہ ہندی گویاں ص ۶۸

[2] فراق گورکھپوری۔ اندازے ۔ ص ۵۷ ۔ لاہور ۱۹۹۵ء

83% 3:36 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

کل میں جو راہ میں اسے پہچان رہ گیا
کچھ وہ بھی مجھ کو دیکھ کے حیران رہ گیا
جو پھرا کے اس نے منہ کو بقصدِ نقاب اُٹھ
اِدھر آسمان اُٹھا، اُدھر آفتاب اُٹھ

تحریکِ اصلاحِ زبان کا یہ دور زیادہ تر اساتذہ کی تقلید کو سامنے لاتا ہے اس تحریک کے زیرِ اثر فنِ شاعری اور عروض پر غیر معمولی توجہ صرف کی گئی۔ محاورات کو صیقل کرنے اور روزمرہ کو مانجھنے کا فریضہ ادا کیا گیا۔ سودا اور میر کو دکن کی زبان صاف کرنے کا دعویٰ تھا۔ چنانچہ سودا نے فارسی کا اثر قبول کیا اور ریختہ کو عجمی زبان کے سانچے میں اُتار دیا اور یوں اُردو کے مادری مزاج سے اس کا رشتہ برائے نام رہ گیا۔ میر نے دِلّی کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی زبان کو اہمیت دی اور زمین کے ساتھ رشتہ برقرار رکھتے ہوئے زبان کو داخلی ارتفاع عطا کیا۔ ان دونوں نے شاہ حاتم کی طرح قواعد وضوابط کی جامد پابندی نہیں کی بلکہ تخلیقی عمل کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا کہ بعض متروکات بھی از خود تخلیق کا حصہ بن گئے۔ سودا کی صنعت کاری اچھا تاثر پیدا نہیں کرتی لیکن میر کو اپنی زبان سے کشمکش کرنی پڑتی ہے[۱] اور وہ لفظ کو یوں منقلب کرتا ہے کہ یہ اس کے مزاج اور شخصیت کا جزو بن جاتا ہے۔ مصحفی اور جرأت کے عہد میں ان متروکات کو جنہیں سودا اور میر نے استعمال کیا تھا کورانہ تقلید کا نمونہ بنایا گیا چنانچہ زبان کی وہ وسعت جو لکھنؤ کے تہذیبی ماحول میں اُجاگر ہونا چاہیئے تھی سامنے نہ آ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موجود زبان کو ہی ضرورتِ شعری کے لئے کافی سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ زبان پر یکسانیت طاری ہونے لگی۔ اس جمود کو ناسخ کی اصلاحی تحریک نے قواعد وضوابط کے حصار میں لینے کی سعی کی اور اُردو زبان کو سنگلاخ زمینوں اور ادق لفظوں کا اسیر بنا دیا۔ ناسخ فارسی الفاظ کی قبولیت پراکرت لفظوں کے اخراج اور ضابطہ پسندی کی تحریک کا سرخیل ہے۔ اس نے اصلاحِ زبان کے لئے متشدد رویہ اختیار کیا اور قدیم پیغمبرانِ سخن کی شریعتیں منسوخ کر دیں[۲]

---

[۱] محمد حسن عسکری۔ ستارہ یا بادبان۔ ص ۲۵۹۔ کراچی ۱۹۶۳ء

[۲] عبدالسلام ندوی۔ شعر الہند۔ ص ۱۵۰

209
684
Scanned with CamScanner

ولی نے جس اجتہاد کی ابتدا کی تھی اس کا نقطۂ انجام ناسخ ہے۔ اس نے دلّی اور لکھنؤ کی زبانوں کو ان کے مزاج کے مطابق تقسیم کیا۔ طریقۂ قدیم کو بدل کر فصاحت اور بلاغت کے اصول فارسی قواعد و ضوابط کے مطابق وضع کئے۔ ناسخ نے اپنے سلسلۂ سخن کے شاعروں کو ان اصولوں پر سختی سے عمل کی تلقین کی اور اکثر اوقات مضمون کو بھی صحتِ زبان کی نذر کر دیا۔ ناسخ کی تحریک کا قبیح پہلو یہ ہے کہ مقامی پراکرتوں کے وہ الفاظ جو عرصے سے اُردو زبان کا فطری حصہ بن چکے تھے عملِ تنسیخ کی زد میں آگئے اور ان کی جگہ عربی اور فارسی کے مشکل، پیچیدہ اور ادق الفاظ کو شعوری طور پر اُردو زبان میں شامل کر دیا گیا۔ چنانچہ اُردو جو اپنی سادگی، نرمی اور سلاست کی بنا پر عوام میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی مشکل گوئی کی راہ پر گامزن ہو گئی۔ اس لحاظ سے بیشتر ناقدین نے ناسخ کی اس تحریک کو منفی لسانی تحریک شمار کیا ہے اور اس عہد کی شاعری کو لفاظی کا کھوکھلا انبار کہا ہے۔

لسانی اعتبار سے ناسخ کی تحریک اُردو زبان کے لکھنوی انداز کو پیش کرتی ہے۔ اور اس میں تکلف، آرائش اور آورد کا پہلو نمایاں ہے۔ چنانچہ لفظ کو ہیرے کی طرح تراش کر نگینے کی طرح بٹھانے کی سعی کی جاتی اور اس پر داد صرف حسنِ بیان اور حسنِ زبان کے زاویے سے حاصل کی جاتی۔ سیاسی زاویے سے دیکھئے تو اس عہد میں انگریزوں نے ایک نئی تہذیب اور ایک نئی زبان کو فروغ دینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ نے اپنی تہذیب اور زبان کو تحفظ مہیا کرنا ضروری خیال کیا اور اس کے گرد قواعد و ضوابط کی مضبوط دیوار کھڑی کر دی۔

ناسخ کے بجائے مرزا غالب اس تحریک کے محرک ہوتے تو یہ نتیجہ نکالنا آسان ہوتا کہ ان کا سلجوقی اور تورانی مزاج اس تحریک کو خونِ گرم مہیا کر رہا ہے۔ لیکن امام بخش ناسخ کو ایرانی روایت سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔ ناسخ خدا بخش خیمہ دوز لاہوری کا فرزند تھا۔ چنانچہ اس کی تربیت میں باپ کے عمل دخل سے انکار ممکن نہیں۔ اور اسے لاہور

؎ بعض محققین نے لکھا ہے کہ ناسخ خدا بخش خیمہ دوز کا لے پالک بیٹا تھا۔

83% 3:36 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

کے معروضی رجحان سے آزاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ناسخ کو پہلوانی کا شوق تھا۔ لذیذ کھانوں اور شیریں پھلوں سے رغبت تھی۔ مذاق کرنے اور جملہ کسنے سے کبھی چوکتے نہ تھے وہ بڑی بات کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور ہمیشہ اپنے جوہر کو آزمانے کی کوشش کرتے۔ میر نے غزل پر اصلاح دینے سے انکار کیا تو غزل پر اپنا سکہ لگانا شروع کر دیا۔ معتمد الدولہ نے خطاب دینے کی خواہش کی تو بگڑ گئے۔ "بولے ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا۔"[1] لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہوتے۔ انشاؔ و مصحفیؔ، جرأتؔ اور ظہور اللہ نواؔ کے ہنگاموں کو خاموش تماشائی بن کر دیکھتے۔ جب زمانہ ورق الٹ چکا تو ناسخ میدان میں اترے اور اپنی تماشہ پسندی کو یوں برقرار رکھا کہ مشاعرے کو اکھاڑہ بنا دیا۔ خوش خوراکی، مقابلہ کرنے اور مسابقت حاصل کرنے کا انداز، تماشہ کرنے اور تماشہ دیکھنے کا رجحان، سب لاہوری مزاج کے بنیادی عناصر ہیں چنانچہ ناسخ نے بھی اس فطری رجحان کے تحت زبان کو بھی زور آزمائی کا وسیلہ اور تماشہ بنانے کی کوشش کی[2] اور نئی زمینوں سے ریختہ کی مضبوط دیواریں اٹھائیں اور اس پر خالص لاہوری لہجے میں فخر کا اظہار کیا۔

سب زمینیں ہیں نئی جیتیں ہیں لے یار نئی
روز یاں ریختہ کی اٹھتی ہے دیوار نئی
خاک میں مل جائیے ایسا اکھاڑہ چاہیے
لڑ کے کشتی دیو ہستی کو پچھاڑا چاہیے

ناسخ نے اردو زبان میں جن تبدیلیوں کو رواج دیا، ان میں سب سے اہم فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال ہے۔ تذکرہ جلوۂ خضر میں ان متروکات کی ایک طویل فہرست درج ہے۔ ان میں سے چند ایک کا یہاں حوالہ دینا مناسب ہے:۔

---

[1] محمد حسین آزاد۔ آب حیات۔ ص ۳۲۵
[2] ایضاً۔ ص ۳۲۹

211
684
Scanned with CamScanner

83% 3:36 PM
ps://www.rekhta.org/eb
9

Rekhta

متروک لفظ	مجوزہ لفظ	متروک لفظ	مجوزہ لفظ
نپٹ	بہت	زنجیری رہنا	قید رہنا
جگ	دنیا	جی چلا	رغبت ہوئی
لاگا	لگا	دم بدم	دم بہ دم
کھوج	نشان	دارو	دوا
ماٹی	مٹی	کنے	کس نے
پالا	پیالہ	نگاہ کا نالہ	نالۂ سحر
سجن	صنم	خیال لینا	خیال باندھنا
ٹک	ذرا	چبھے ہے	چبھتا ہے
مہندی کے رنگ	رنگِ حنا	لگن لگا دی	محبت لگا دی

بلاشبہ ناسخ نے جن الفاظ کو رواج دیا ان میں بیشتر مرورِ ایام کے ساتھ اب اردو کے مزاج میں جذب ہو گئے ہیں تاہم میر اور ناسخ کے درمیان چونکہ زمانی فاصلہ زیادہ نہیں ہے اور الفاظ کی یہ تبدیلی ہنگامی بنیادوں پر عمل میں لائی گئی تھی اس لئے یہ تغیر فطری اصولِ ارتقا کے مطابق نظر نہیں آتا اور اس تطہیر میں کئی ایسے الفاظ بھی متروک ہو گئے جن کا نعم البدل اردو میں دستیاب نہیں تھا۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:-

گل مت سمجھیو باغ میں لے خندہ لبیا — غنچے کا دل دہن پہ کسی کے بکھر جا
یوں ہے ڈھلک تن کی اس پیرہن کی تہ میں — سرخی بدن کی جھلکے جیسے برن کی تہ میں
نالے سے میرا گل تو ہوا چاک پیرہن — بلبل ترا جگر نہ یہ سن کر تڑک گیا

ان سادہ اور دل نشیں اشعار کے مقابلے میں ناسخ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں زبان قواعد و ضوابط کی پابندیوں میں کراہتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

آغازِ شب میں اژدرِ فرعون ہے جو زلف
افسونِ خط مار ہی افسانہ ہو گیا

Scanned with CamScanner

83% 3:36 PM
ps://www.rekhta.org/eb

قمری کیا ترے آگے محاق میں آیا | کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا
باعث گریہ ہوئی فرقت میں مجھ کو میکشی | ساقیا اشکوں سے مے کا استحالہ ہوگیا

ناسخ نے حشو و زوائد کے استعمال پر کڑی پابندی لگائی، تنافر، غرابت اور تعقید سے بچنے کی تلقین کی اور بندش کے طرزِ فارسی کو فروغ دیا۔ ان سب کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی لفظوں اور اضافتوں کا استعمال بہت زیادہ ہوگیا۔ اور بیشتر ایسے اشعار تخلیق ہونے لگے جن میں صرف فعل اور حرفِ اضافت بدلنے سے اشعار فارسی کے قالب میں ڈھل جاتے تھے۔

سوالِ وصل پہ ہلنا پری رو تیرے ابرو کا
اشارہ ہے بہ باب عاشقاں بر شاخ آہو کا
آرائشِ جمالِ خداداد عیب ہے
موئے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا
بعد مُردن بھی ہے باقی مجھ سے خوش چشمی کی صند
سبزۂ تربت چراگاہِ غزالاں ہوگیا
یاں سر کاوش توانائی کے عالم میں نہ تھا
آج جسم ناتواں کیوں خار پائے مور ہے

ناسخ نے اُردو کی صرف اور نحو کو درست کیا۔ روزمرہ اور محاورات کی چھان پھٹک کی اور اس کے قاعدے مقرر کئے۔ تمام مستعمل الفاظ کی تذکیر و تانیث کے اصول تراشے، افعال اور مصادر میں اہم تبدیلیاں کیں۔ عروض و قافیہ کے لحاظ سے وزن اور شعر کی درستی پر زور دیا۔ ناسخ کے یہ سب اصول حکم اور ضابطے کی حیثیت رکھتے تھے اور ان سے انحراف کی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ لکھنؤ میں ناسخ کی زبان کسوٹی بن گئی۔ ناسخ نے ریختہ کو اُردو زبان کا نام دیا[1] اور محاورۂ دہلی کے مقابلے میں محاورۂ لکھنؤ وضع کیا۔ پہلے غزل

---

[1] عبدالسلام ندوی۔ شعر الہند۔ ص ۱۵۹۔

Scanned with CamScanner

82% 3:36 PM
ps://www.rekhta.org/eb

کو بھی ریختہ کہا جاتا تھا لیکن ناسخ نے صنفِ غزل کے لیے ریختہ کو متروک قرار دے دیا۔

ناسخ کی اصلاحی تحریک کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔ قدما کے ہاں ہجو میں فحش نگاری اور بدزبانی کا رجحان عام تھا۔ اس قبیح روش نے آہستہ آہستہ غزل میں بھی راہ پائی۔ ناسخ نے فحش الفاظ کو غزل میں ممنوع قرار دیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ شعرا غزل کے ایک اہم موضوع، عشق سے شعوری پر انحراف برتنے لگے اور یوں زندگی کے دوسرے موضوعات کو بھی غزل میں راہ مل گئی۔ ناسخ کی ضابطہ پسندی کو بالعموم قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ تاہم غزل کے موضوعات کو وسعت دینے کا اقدام ایسا ہے جس کی تحسین ضروری ہے۔

مجموعی اعتبار سے ناسخ کی تحریک کانٹ چھانٹ اور تراش خراش سے عبارت ہے۔ اس تحریک نے بھاشا، ہندی اور پراکرتی ہندی الاصل الفاظ کے استعمال پر پابندی عائد کی اور بقول امداد امام اثر زبان کو ایسا درست کیا کہ اب اس کی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم معلوم نہیں ہوتی۔[1] تاہم اس اصلاحی کوشش میں اردو زبان سے ہندی رس ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ناسخ کی تحریک کی نوعیت زیادہ تر تہذیبی اور آرائشی ہے۔ اس نے ولی اور میر اور ان کے معاصروں کی فتوحات کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔

دلی میں ناسخ کی تحریک کا متوازی زاویہ غالب کی شخصیت سے ابھرا۔ فارسی زبان شاعری اور ادب سے میرزا غالب کا لگاؤ فطری تھا۔ غالب شرفائے دلی میں شمار ہوتے تھے، سلجوقی نژاد تھے اور بقول مولانا حالی اخیر عمر میں بھی ایک نووارد تورانی معلوم ہوتے تھے۔[2] غالب نے جب اردو شاعری کی طرف رجوع کیا تو ان کا فارسی ذوق پختہ ہو چکا تھا، اور وہ اردو میں بھی اسی رنگ کو آزمانے پر آمادہ تھے۔[3] تاہم غالب کی انفرادی خوبی

---

[1] امداد امام اثر۔ کاشف الحقائق۔ ص ۱۷۱

[2] حالی۔ یادگار غالب۔ ص ۷۵

[3] اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے ؎ مجھے رنگِ بہار ایجادیِ بیدل پسند آیا

Scanned with CamScanner

ps://www.rekhta.org/eb

یہ ہے کہ اس کی مشکل پسندی محض الفاظ کی استخواں بندی نہیں بلکہ اس نے موضوعات کے بے نظیر تنوع کو احاطہ کرنے کی کوشش کی اور لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا۔ غالبؔ کی علمی استعداد، خاندانی برتری اور شخصی عظمت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سنگلاخ زمینوں میں اُلجھنے کے بجائے مشکل خیالات اور ادق علمی مسائل اور اسلوب و بیان کی ندرتوں سے نبرد آزما ہوا اور ان سب کے اظہار کے لئے اتنا مشکل انداز اختیار کیا کہ غالبؔ کی اُردو شاعری فارسی زبان کا چربہ نظر آنے لگی اور ارباب زمانہ ابلاغ سے محروم ہو گئے۔ غالبؔ کے اس اسلوب فن کے چند اشعار درج ذیل ہیں:-

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا — تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
کوکب بخت بجز روزن پرورد نہیں — عینک چشم جنوں، حلقۂ کاکل تا چند
قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خط جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

غالبؔ چونکہ معنویت کو لفاظی پر اہمیت دیتے تھے اس لئے یہ کہنا مناسب ہے کہ ناسخ نے اصلاح زبان، کفایت لفظی، بندش اور تراکیب کے جو اصول وضع کئے تھے ان سب کو غالبؔ نے کسی خارجی تحریک کے بغیر عملی طور پر استعمال کیا اور اس لحاظ سے غالبؔ نے تحریک اصلاح زبان میں معنی خیزی کو پروان چڑھایا ہے۔ تاہم غالبؔ کی اس مشکل گوئی کو اس زمانے میں بھی جب فارسی زبان ابھی پوری طرح معدوم نہیں ہوئی تھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ چنانچہ خود غالبؔ کے ہاں اس کے خلاف ردِ عمل پیدا ہوا اور اس نے سادہ گوئی کی طرف پیش قدمی کر لی۔ غالبؔ کی اُردو غزلوں کا منتخب دیوان اس حقیقت کا غماز ہے کہ مرزا نے نادر اور برگزیدہ خیالات کو سادہ زبان میں ادا کرنے کی جو کاوش کی اس سے اُردو زبان کے نئے امکانات سامنے آئے اور یہ زبان ہر قسم کے مضامین کے اظہار پر قادر ہو گئی۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:-

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

Scanned with CamScanner

82% 3:36 PM
ps://www.rekhta.org/eb
اردو ادب کی تحریکیں

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

ان اشعار کی خصوصی اہمیت یہ ہے کہ غالب نے اُردو زبان کو فارسی کے سرچشمے سے ہی سیراب کیا ہے اور مقامی زبانوں کو قریب نہیں آنے دیا۔ فارسی غزل میں غالب نے شیخ علی حزیں، طالب آملی، عرفی شیرازی، ظہوری اور نظیری سے جو فیضان حاصل کیا تھا، اس کو اردو شاعری میں بھی آزمایا۔ غالب کا اُردو بھی نہ صرف فارسی زبان کا پرتو پیش کرتا ہے بلکہ غالب اُردو کو بھی رشکِ فارسی بنانے کا دعویدار تھا۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اس لحاظ سے غالب کا اصلاحی رد عمل اپنی مثال آپ ہے تاہم میر انیس کے ہاں اس کی نمو موضوع کے داخلی تقاضے سے ظاہر ہوئی۔ میر انیس نے مرثیے میں ایک بڑے موضوع کو سمونے اور عظمتِ آدم اُجاگر کرنے کی سعی کی تو لامحالہ انہوں نے اپنا تعلق فارسی زبان سے قائم کیا جس کے پس پشت عظیم شعری روایت اور لسانی وجاہت و جلال کی طویل تاریخ موجود تھی۔ بلاشبہ انہوں نے کمالِ فن کا اظہار اعجازِ بیان سے ظاہر کیا اور ان کی زبان کی چابکدستی میں فارسی شاعری کی متعدد صنعتیں مثلاً مراعاۃ النظیر، حسنِ تعلیل، لف و نشر، تجنیس، تلمیح، تکرار، تضاد اور مبالغہ وغیرہ استعمال ہوئیں تاہم انہوں نے عوام سے اپنا رابطہ قائم رکھا۔ چنانچہ اصلاحِ زبان کی تحریک میں میر انیس کی ایک عطا یہ بھی ہے کہ انہوں نے عوام کے ذوقِ سخن کی تربیت کی اور انہیں لسانی سطح پر بلند مقام پر پہنچا دیا۔ ان کی شاعری میں بلا کا تحرک اور روانی ہے لیکن اس کے خارجی خول پر فارسی کا غلبہ صاف نظر آتا ہے۔

درجِ دہن پہ لعل و عقیق یمن نثار
جرار و بردبار و دلاور سخی غیور

Scanned with CamScanner

(6) اردو میں اصلاح زبان کی روایت

- ایہام گوئی کی تحریک کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی تھی اسے اصلاحِ زبان کی تحریک کہتے ہیں۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک میں اولیت مرزا مظہر جانِ جاناں کو حاصل ہے۔
- مرزا مظہر جانِ جاناں نے فارسی اور اردو زبان کو ایک ہی تار سے بننے کی کوشش کی تھی۔
- مرزا مظہر جانِ جاناں نے اصلاح زبان کو مذہبی اور سیاسی فریضہ سمجھ کر انجام دیا تھا۔
- مرزا مظہر جانِ جاناں نے اپنے شاگردوں کو نئی زبان میں شعر کہنے پر آمادہ کیا تھا۔
- شاہ حاتم نے اصلاح زبان سے متعلق قواعد وضوابط مرتب کیے تھے۔
- ملک بھر میں ایک مرکزی ریختہ رائج کرنے اور زبان کو غیر مانوس الفاظ سے پاک وصاف کرنے کی سعی شاہ حاتم نے کی تھی۔
- ریختہ میں فارسی فعل وحروف مثلاً در، بر، از، او وغیرہ کے استعمال کو ناجائز شاہ حاتم نے قرار دیا تھا۔
- عربی وفارسی الفاظ کو صحت املا کے ساتھ لکھنے کی تاکید شاہ حاتم نے کی تھی۔
- ہندی بھاشا مثلاً نین، جگت، نت، موا، بجن، من اور موہن وغیرہ کا استعمال شاعری میں شاہ حاتم نے عیب قرار دیا تھا۔
- متروک الفاظ اور ان کے متبادل مانوس الفاظ کی فہرست شاہ حاتم نے مرتب کی تھی۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک کو تصوف کے آئینے میں درد نے دیکھا تھا۔
- اصلاحِ زبان کی تحریک میں اردو زبان کا نیا وجود سودا کا مرہون منت ہے۔

(اردو ادب کی تحریکیں: انور سدید، صفحہ 206)

- میر نے ریختہ میں فارسی حروف اور افعال، غیر مانوس تراکیب اور نامناسب بندشوں کے استعمال کو قبیح قرار دیا ہے۔
- میر نے فارسی کی ایسی تراکیب جو زبان ریختہ سے مناسبت رکھتی ہوں کہ استعمال کرنے کی اجازت دی ہے۔
- میر نے سیر، جراحت، جان، سطح اور خلش وغیرہ کو مذکر اور خواب، گلزار، حشر، مزار وغیرہ کو مونث باندھا ہے۔
- روزمرہ کے مجلسی لہجے کو زبان کے ادبی لہجے سے ہم آہنگ میر حسن نے کیا تھا۔
- اصلاح زبان کے حوالے سے سب سے بڑا کام ناسخ نے کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

ناسخ

ناسخ کا نام شیخ امام بخش تھا اور ناسخ تخلص۔

ناسخ 1772ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

ناسخ کا انتقال 1838ء میں لکھنؤ میں ہوا تھا۔

ناسخ کے والد کا نام شیخ خدا بخش تھا جو تاجر پیشہ اور لاہور کے رہنے والے تھے۔

ناسخ کسی کے شاگرد نہیں تھے۔ ناسخ نے خود اپنی کوشش سے فن شاعری اور متعلقہ علوم پر ایسی قدرت حاصل کی تھی کہ استادِ وقت بن گئے تھے۔

ناسخ کا رنگ کالا اور جسم بھدا تھا۔ ناسخ ورزش کے بے حد شوقین تھے۔

ناسخ دن رات میں صرف ایک بار کھاتے تھے مگر اس کا وزن پانچ سیر کے قریب ہوتا تھا۔

ناسخ کی غزل پر اصلاح دینے سے میر نے انکار کر دیا تھا۔

غازی الدین حیدر نے ناسخ کو اپنے دربار سے متعلق کر کے ملک الشعرا کے خطاب کی پیش کش کی تھی جسے ناسخ نے قبول نہیں کیا تھا اور کہا تھا کہ اتنے چھوٹے سے بادشاہ کا خطاب مجھے قبول نہیں۔

ناسخ کو تنقید نگاروں نے ادبی ڈکٹیٹر کہا ہے کیونکہ انھوں نے جو اصلاحیں تجویز کیں ان پر خود بھی سختی سے عمل کیا ہے اور شاگردوں سے بھی اس پر عمل کرایا ہے۔

ناسخ دبستان لکھنؤ کے نمائندہ شاعروں میں سے ہیں۔

اصلاحِ زبان کے حوالے سے ناسخ کا کارنامہ

سب سے پہلے ناسخ نے زبان کا نام اردو مستند قرار دیا اس کے علاوہ اردو کے جتنے نام رہ چکے تھے اور جو چلے آرہے تھے مثلاً ہندوی، ہندوستانی، زبانِ ہندوستان دہلوی یا لاہوری، ریختہ یا اردوے معلٰی اور دکنی ان سب کی جگہ ناسخ نے یہ اصول طے کر دیا کہ آئندہ محض ایک نام 'اردو' ہوگا ہر دوسرا نام متروک سمجھا جائے گا۔

ردیف میں اصلاح: ناسخ نے حروفِ ربط کو اردو غزل کی زمینوں میں استعمال کیا اور ردیف کی بنیاد حروفِ ربط یعنی کا، کی، کے، کو، سے، نے، پر اور تک وغیرہ پر رکھی۔

حروفِ اثبات و نفی کا استعمال: ہے اور نہیں کو بھی شاعری میں استعمال کیا جانے لگا۔ نئی زمینوں کے

بارے میں یہ شعر ملاحظہ ہو اور نہیں کا استعمال بھی

سب زمینیں ہیں نئی بیتیں نہیں اے یار نئی
روز یہاں ریختہ کی اٹھتی ہے دیوار نئی

مصادر میں تبدیلی: جو مصادر تھے ناسخ نے صرف انھیں کے استعمال کی اجازت روا رکھی ہے وہ مصادر جو اصولاً غلط تھے جنھیں بعض شعرا نے اپنی آسانی کے سبب گھڑ لیا تھا، انھیں متروک قرار دیا گیا۔ مثال کے طور پر مجبور کا شعر ہے۔

باتیں دیکھ زمانے کی جی باتوں میں بہلاتا ہے
خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہلاتا ہے

افعال میں ترمیم: بہت سے مروجہ افعال جواز روئے اصول غلط تھے ان کا بدل ناسخ نے قائم کیا مثلاً:

مروجہ فعل	بدل	مروجہ فعل	بدل	مروجہ فعل	بدل
بدلہ کرنا	بدلہ لینا	جھکے ہے	جھکتا ہے	لگے ہے	لگتا ہے
لاگا	لگا	کوہ چیرا	کوہ پھاڑا	کہے ہیں	کہتے ہیں
آئے ہے	آتا ہے	جائے ہے	جاتا ہے	سمجھا جائے ہے	سمجھاتا ہے

مثلاً شعر ہے

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل
کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جائے ہے

یا مومن کا مصرعہ ہے

کس کے استقبال کو جی میرا تن سے جائے ہے

ہندی اور بھاشا کے الفاظ کا ترک: ناسخ نے ہندی اور بھاشا کے الفاظ کو ترک کر کے ان کی جگہ فارسی الفاظ اور عربی الفاظ و اصطلاحات کو زیادہ استعمال کیا مثلاً ٹک اور تنک کی جگہ ذرا بن کی جگہ بغیر دوانہ کے بجائے دیوانہ یوں کے بجائے سوا ماٹی کی جگہ مٹی کو معیاری قرار دیا ہے۔

ضمائر میں تبدل: فارسی عربی اور ہندی زبان کے جو ضمائر اردو میں مستعمل تھے ان میں بعض کو بالکل ترک کرنے کا حکم دیا گیا اور بعض میں تبدیلی کر کے ان کا استعمال روا رکھا گیا مثلاً اس نے سے ان نے ترے یا تجھ کو سے تجھ جس نے سے جن نے تو سے تئیں۔

تذکیر و تانیث: ناسخ کے زمانے تک تذکیر و تانیث کا کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے بھی قاعدے مقرر کیے مثلاً زمیں (مؤنث)، زخم (مذکر)، وہ چیز جدی ہے کہنے کے

...وہ چیز جدا ہے' وغیرہ کہنے پر زور دیا ہے۔

...واحد کے صیغے: جمع بنانے کا دکنی قاعدہ ان کے بجائے 'یں' بنایا گیا۔ پہلے عورت کی جمع عورتاں بات
...جمع باتاں مستعمل تھا۔ ناسخ نے عورتیں اور باتیں کو مستند قرار دیا۔

...محاورات کی اصلاح: مروجہ محاوروں میں بھی اصلاح کی گئی۔ قدرے تبدیلی کر کے ان کی صحیح شکل
...جاری کی گئی۔ مثلاً:

مروجہ	اصلاح شدہ	مروجہ	اصلاح شدہ
رورکھنا	مونھ رکھنا	خیال لینا	خیال باندھنا
انتہالانا	انتہا کو پہنچنا	زنجیر رہنا	قیدی رہنا
پلک مارنا	پلک جھپکنا	دامن چلنا	دامن مسکنا

ناسخ نے معشوق اور محبوب کے لیے ہندی لفظ بجن کی جگہ فارسی صنم کو درست قرار دیا ہے۔

قدما بول چال کی زبان کو کلام میں باندھتے تھے اس کے لیے ناسخ نے ایسے الفاظ زبان سے بالکل چھانٹ دیئے۔

ناسخ نے جذبہ واحساس کو خارج کر کے معنی بندی اور مضمون آفرینی پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی تھی اور ساتھ ہی ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جو شاعری کے لیے کھردرے اور بے ڈول سمجھے جاتے تھے۔

ناسخ نے ہندی الاصل الفاظ کو طرزِ جدید سے خارج کر کے اس کی جگہ فارسی و عربی کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

ناسخ نے حشو و زوائد کے استعمال پر کڑی پابندی لگائی تھی، غرابت اور تعقید سے بچنے کی تلقین کی تھی اور بندش کے طرز فارسی کو فروغ دیا تھا۔

فحش الفاظ کو غزل میں ناسخ نے ممنوع قرار دیا تھا۔

ریختہ کو اردو زبان کا نام ناسخ نے دیا تھا۔ (شعر الہند از عبدالسلام ندوی ص 159)

محاورۂ دہلی کے مقابلے میں محاورۂ لکھنؤ ناسخ نے وضع کیا تھا۔

صنف غزل کے لیے ریختہ کو متروک ناسخ نے قرار دیا تھا۔ معلوم ہو کہ پہلے غزل کو بھی ریختہ کہا جاتا تھا۔

غزل کو عاشقانہ جذبات کے علاوہ دیگر مضامین کی ادائیگی کے قابل ناسخ نے بنایا تھا۔

ناسخ نے اپنی غزلوں میں 'مثالیہ' کو کثرت سے برتا ہے۔ مثالیہ میں شاعر ایک مصرع میں ایک بات کہتا ہے جسے آپ دعویٰ کہہ سکتے ہیں اور پھر اس بات (دعویٰ) کو قابل قبول، پراثر اور مدلل

بنانے کے لیے ایک دلیل لاتا ہے۔

ناسخ کے شاگرد

* ڈاکٹر انصار اللہ نظر نے ناسخ کے شاگردوں کی تعداد کم سے کم 103 بتائی ہے۔
* علی اوسط رشک کا نام شاگردانِ ناسخ میں اہمیت کا حامل ہے۔
* آغا حسن امانت * سید محمد مرزا انس * امداد علی بحر
* فتح الدولہ * محمد رضا برق
* محمد عظیم اللہ رغمی ابن امین اللہ طوفان * غلام امام شہید
* فقیر محمد خان گویا * منیر شکوہ آبادی * حاتم علی بیگ مہر
* خواجہ محمد وزیر * کلب حسین نادر

ناسخ کے کارنامے

- ناسخ کے کل چار دیوان ہیں: تین اردو میں اور ایک فارسی میں۔
- دیوان اول کا تاریخی نام 'دیوان ناسخ' ہے جسے ناسخ کے شاگرد میاں غنی نے تجویز کیا تھا۔
- دیوانِ دوم کا تاریخی نام 'دفتر پریشان' ہے۔
- دیوان سوم کا تاریخی نام دو دفتر شعر ہے اسے ناسخ کے شاگرد میر علی اوسط رشک نے تجویز کیا تھا۔

ناسخ کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- اس (ناسخ) نے اصلاحِ زبان کے لیے متشددرویہ اختیار کیا تھا اور قدیم پیغمبرانِ سخن کی شریعتیں منسوخ کر دیں (عبدالسلام ندوی شعرالہند)
- ولی نے جس اجتہاد کی ابتدا کی تھی اس کا نقطۂ انجام ناسخ ہے۔ (انور سدید)
- غالب نے ناسخ کے رنگ سخن کو 'طرزِ جدید' کا نام دیا ہے اور ناسخ کو طرزِ جدید کا موجد ٹھہرایا ہے۔
- کلب حسین خان نادر نے ناسخ کو 'واضح طرزِ جدید' قرار دیا ہے۔
- مرزا محمد رضا برق نے ناسخ کے متعلق لکھا ہے کہ 'سادہ گوئی' کے ناسخ اور طرزِ نو (تازہ گوئی) کے ایجاد کرنے والے ہیں۔
- وہ (ناسخ) پرانی ناہموار روشوں کے ناسخ ہیں (غالب)

Scanned with CamScanner

(7) اردو میں ایہام گوئی

- ایہام عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے 'وہم میں ڈالنا'
- ایہام گوئی کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے کلام میں ایسا ذو معنی لفظ استعمال کرے جس سے سننے والا تھوڑی دیر کے لیے وہم میں پڑ جائے کہ آخر اس کے صحیح معنی کیا ہیں؟ عام طور سے ایسے لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں ایک معنی قریب جو آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے لیکن وہ شاعر کی مراد نہیں ہوتا اور دوسرا معنی بعید جو تھوڑے تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے اور یہی معنی بعید شاعر کی مراد ہوتا ہے۔
- اردو میں ایہام گوئی کا رواج سب سے زیادہ محمد شاہی عہد میں ہوا تھا۔ اردو میں ایہام ہندی شاعری کے اثر سے آیا ہے۔
- خواجہ میر درد نے ایہام کو لفظ دوئی قرار دیا ہے۔
- محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اردو میں ایہام کو ہندی دوہوں کی اساس پر فروغ حاصل ہوا۔
- ایسا ہی مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ اردو ایہام پر زیادہ تر ہندی شاعری کا اثر ہوا اور ہندی میں یہ چیز سنسکرت سے پہنچی ہے۔
- ایہام کی تحریک کا نقطۂ آغاز ولی کو قرار دیا جاتا ہے۔ (اردو ادب کی تحریکیں، ص 190)
- ایہام گوئی کے نامور شعرا میں آرزو، آبرو، شاکر ناجی، یک رنگ اور مضمون کا شمار ہوتا ہے۔
- احسن، شاہ ولی اللہ اشتیاق، عبدالوہاب یکرو اور میر محمد سجاد بھی ایہام گو شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔
- شاہ حاتم کا بھی رجحان ابتداءً ایہام گوئی کی طرف تھا۔
- تحریکِ ایہام کے خلاف ردِ عمل کا اظہار مرزا مظہرِ جانِ جاناں، انعام اللہ خاں یقیں، ظہور الدین حاتم اور مرزا محمد رفیع سودا نے کیا تھا۔
- سب سے پہلے ایہام گوئی کے خلاف مرزا مظہر جانِ جاناں نے آواز بلند کی تھی۔
- انگلستان میں ملکہ ایلزبتھ کے دربار میں ایہام کا بہت زور تھا۔
- شیکسپیئر کے ڈراموں میں ایہام (Pun) کثرت سے استعمال ہوا ہے۔
- مغرب میں مرزا مظہر جانِ جاناں کی طرح ڈاکٹر جانسن نے ایہام گوئی کے خلاف مہم چلائی تھی اور اسے مبتذل کہہ کر رد کر دیا تھا۔
- فرانس میں لوئی چہاردہم کے عہد میں ایہام کا رواج ہوا تھا۔
- ولی کے تلامذہ میں سے شیخ نثار، عمر، رضی اور اشرف اور ان کے معنوی تلامذہ میں سے سراج، داؤد اور عزلت وغیرہ نے دکن میں ایہام کو اپنا شعار بنایا تھا۔ (اردو ادب کی تحریکیں از انور سدید، صفحہ 190)

Scanned with CamScanner

ایہام سے متعلق شعرا

خان آرزو

- نام شیخ سراج الدین علی، خطاب استعداد خاں اور تخلص آرزو تھا۔
- خان آرزو بنیادی طور پر فارسی کے شاعر تھے۔
- خان آرزو نے اردو میں تقریباً 27 اشعار کہے ہیں۔
- خان آرزو صنعت ایہام کے استاد مانے جاتے تھے۔
- میر نے آرزو کو 'استاد و پیر و مرشد بندہ' کہا ہے۔
- میر نے لکھا ہے کہ 'اس فنِ بے اعتبار کو جسے ہم نے اختیار کر لیا ہے (آرزو نے) معتبر بنایا، ..... تمام ثقہ استادان فنِ ریختہ بھی انہی بزرگوار کے شاگرد ہیں۔

خان آرزو کے شاگرد

- سودا * میر * درد * شاہ مبارک آبرو
- مضمون * مصطفیٰ خان * یک رنگ * آنند رام مخلص
- نیک چند بہار

- خان آرزو کی ایہام گوئی کی ایک مثال

جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں زندگانی کا کیا بھروسا ہے

اس شعر میں 'جان' سے صنعت ایہام پیدا کی گئی ہے۔

☑

آبرو

- آبرو کا نام نجم الدین، عرفیت شاہ مبارک اور تخلص آبرو تھا۔
- آبرو خان آرزو کے شاگرد اور رشتہ دار تھے۔
- آبرو گوالیار میں پیدا ہوئے اور جوانی میں دہلی آ کر سکونت اختیار کر لی تھی۔
- آبرو کے ایک آنکھ میں پھولا تھا جسے طنزاً مرزا مظہر جانِ جاناں نے 'گانٹھ' کہا ہے۔

Scanned with CamScanner

- خوشگو نے آبرو کے بارے میں کہا ہے کہ ریختۂ آبرو، آبروے شعر ریختہ یعنی آبرو اردو شاعری کے آبرو ہیں۔
- آبرو کو ایہام گویوں کا رہنما کہا جاتا ہے۔
- آبرو کی شاعری سے ایہام کی مثالیں

ہوئے ہیں اہلِ زر خواہانِ دولت خواب غفلت میں
جسے سونا ہے یارو فرش پر مخمل کے کہہ سوجا

- زر کے معنی سونا، سونا کے معنی نیند۔ خواہانِ دولت کا خواب غفلت سے تعلق بھی واضح ہے۔ یہاں الفاظ و معانی دونوں سے ایہام پیدا کیا گیا ہے:

معشوق سانولا ہو تو کرتا ہے دل کوں پیار
کالے کی چاہ میں ظاہر ہے من کے ساتھ

- من بمعنی دل اور طبیعت، اور من وہ مہرہ جو کالے سانپ کے پیٹ میں ہوتا ہے اور جس وقت سانپ شب تاریک میں اس کو اگلتا ہے تو وہ شعلے کی طرح چمکنے لگتا ہے۔ اس شعر میں من سے صنعت ایہام پیدا کی گئی ہے۔

☑

شاکر ناجی

- محمد شاکر ناجی دہلی کے رہنے والے تھے۔
- محمد شاکر ناجی پیشے کے اعتبار سے سپاہی تھے
- محمد شاکر ناجی اپنے ایہام گوئی پر فخر کرتے تھے۔
- امرد پرستی سے متعلق اشعار سب سے زیادہ ناجی کے دیوان میں ملتے ہیں۔
- میر نے ناجی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا مزاج زیادہ تر ہزل کی طرف مائل تھا۔

نمونۂ کلام

تجھ کو کیوں کر جدا کروں اے جان زندگانی بہت ہی پیاری ہے

☑

Scanned with CamScanner

یک رنگ

- یک رنگ کا نام مصطفیٰ خان تھا اور یک رنگ تخلص
- مصطفیٰ خان یک رنگ مضمون کے معاصر تھے اور انھیں کے طرز میں شعر کہتے تھے۔

نمونۂ کلام

عبث کو بے کسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوا نے عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے میرا صبر و قرار جاتا ہے

☑

مضمون

- نام شیخ شرف الدین تھا اور مضمون تخلص۔
- مضمون اکبر آباد کے رہنے والے تھے۔
- مضمون بابا فرید گنج شکر کی اولاد میں سے تھے۔
- مضمون ایہام گوئی کے بنیاد رکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔
- مضمون کو بھی ناجی کی طرح اپنی ایہام گوئی پر بڑا ناز تھا۔
- مضمون نے:

ہوا ہے جگ میں مضمون شہرہ تیرہ
طرح طرح ایہام کی جب سیں .....

- شیخ شرف الدین مضمون، خان آرزو کے شاگرد تھے۔
- مضمون کے سارے دانت نزلے کے سبب گر گئے تھے اس لیے آرزو انھیں 'شاعر بے دانہ' کہتے تھے۔
- ایہام گوئی کی مثالیں مضمون کی شاعری سے:

کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج
مضمون شکر کر کہ ترا نام سن رقیب غصے سے بھوت ہو گیا لیکن جلا تو ہے

مرزا مظہر جانِ جاناں

- مرزا مظہر کا نام جانِ جاناں، تخلص مظہر اور لقب شمس الدین حبیب اللہ تھا۔
- مرزا مظہر عوام میں جان جاناں کے نام سے مشہور تھے۔
- تحریک ایہام کے خلاف سب سے پہلے ردِ عمل کا اظہار کرنے والے مرزا مظہر جانِ جاناں تھے۔

مرزا کی تصانیف

(1) دیوانِ فارسی (2) خریطۂ جواہر (3) اردو کلام

نمونۂ کلام

خدا کے واسطے اس کوں نہ ٹوکو — یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے
یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے — کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے

مظہر جان جاناں کے شاگرد

* یقین	* جزیں	* قلی خان حسرت
* بیان	* دردمند	* قدرت اللہ قدرت
* بساون لعل بیدار		

شاہ حاتم

- نام شیخ ظہور الدین حاتم تھا لیکن عرف عام میں شاہ حاتم کے نام سے موسوم تھے۔
- لفظ 'ظہور' شاہ حاتم کا تاریخی نام ہے جس سے سنہ ولادت 1111ھ مطابق 1700-1699 برآمد ہوتا ہے۔
- شاہ حاتم نے ساری عمر شادی نہیں کی اور آزادانہ زندگی گزار دی۔
- شاہ حاتم ابتدا میں رمزی تخلص کرتے تھے لیکن بعد میں شاہ حاتم اختیار کر لیا تھا۔
- شاہ حاتم جوانی میں سپاہی پیشہ تھے۔
- شاہ حاتم دلی میں 1700-1699 میں پیدا ہوئے تھے۔

Scanned with CamScanner

- شاہ حاتم نے اپنی طویل زندگی میں اردو شاعری کی دو تحریکوں (ایہام گوئی اور ردِ عمل کی تحریک) کا ساتھ دیا تھا۔
- شاہ حاتم نے ابتداً آبرو، ناجی اور مضمون کے ساتھ ایہام گوئی کی تحریک میں شامل رہ کر 1144ھ/1731-32 میں اپنا دیوان (قدیم) مرتب کیا تھا۔
- شاہ حاتم نے بعد میں مرزا جانِ جاناں کی تحریک کے زیرِ اثر ایہام گوئی سے کنارہ کشی اختیار کیا تھا اور ایہام گوئی کے خلاف ردِ عمل کی تحریک میں شامل ہوئے تھے۔
- شاہ حاتم نے ردِ عمل کی تحریک میں شامل ہو کر اپنے قدیم دیوان کو مسترد کر دیا تھا اور 'دیوان زادہ' کے نام سے نیا دیوان 1169ھ/1755-56ء میں مرتب کیا تھا۔
- شیخ ظہور الدین حاتم نے ولی کے دیوان سے گہرا اثر لیا ہے اور ولی کے ساتھ معنوی تلمذ کا رشتہ قائم کیا۔

نمونۂ کلام

زندگی درد سر ہوئی حاتم کب ملے گا مجھے پیا میرا
ہجر کی زندگی سے موت بھلی کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

☑

(8) اردو ادب میں رومانی تحریک

- رومانیت ایک جذبہ اور ایک طرزِ فکر سے عبارت ہے جو حد سے بڑھی ہوئی منطقیت اور عقلیت پسندی کے ردِعمل میں ظہور پذیر ہوئی تھی۔
- اردو ادب میں رومانوی تحریک سرسید اور علی گڑھ تحریک کی منطقیت اور عقلیت پسندی کے ردِعمل کے طور پر وجود میں آئی تھی۔
- رومانیت کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری حصے میں ہوئی تھی لیکن اسے فروغ پہلی جنگ عظیم کے بعد یعنی بیسویں صدی میں حاصل ہوا تھا۔
- یاد رہے کہ علی گڑھ تحریک بھی انیسویں صدی کی تحریک ہے تو اس طرح تحریکات کی ترتیب یوں ہے: علی گڑھ تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق
- رومانیت پسند ادیب و شاعر سماج سے زیادہ فرد پر زور دیتا ہے۔
- رومانیت کی ابتدا کا سہرا روسو کے سر باندھا جاتا ہے جس نے کائنات کو زنداں تصور کیا تھا اور آزادی کا مرجع دل کو بنایا تھا۔
- مغربی شعرا و ادبا میں سے ولیم بلیک، کولرج، ورڈسورتھ، شیلے اور کیٹس وغیرہ نے رومانوی تحریک کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اردو ادب میں سرسید کی عقلیت کے خلاف عہد سرسید میں سب سے پہلے رومانی ردِعمل کا اظہار محمد حسین آزاد، ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر نے کیا تھا۔

اردو ادب میں رومانیت کے اوّلین نقوش میر ناصر علی دہلوی کی تحریروں کو قرار دیا جاتا ہے۔

میر ناصر علی دہلوی نے تہذیب الاخلاق کے مقابلے میں ''تیرہویں صدی، فسانۂ ایام اور صلاے عام'' وغیرہ کے نام سے رومانی رسائل جاری کیے تھے۔

مخزن جس کا اجرا 1901 میں عبدالقادر کی ادارت میں ہوا تھا اس رسالے سے بھی رومانوی تحریک کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔

محمد حسین آزاد، ناصر علی دہلوی اور عبدالحلیم شرر کا تعلق رومانیت کی صبح کاذب کے ساتھ تھا تو اقبال اور ابوالکلام نے اسے صبح صادق کا اجالا عطا کیا اور یلدرم، سجاد انصاری، مہدی افادی، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی اور نیاز فتح پوری کے عہد میں یہ تحریک نصف النہار پر پہنچ گئی۔

Scanned with CamScanner

(اردو ادب کی تحریکیں از انور سدید، ص 431)

ادب لطیف کے شماروں کے ذریعے بھی رومانوی تحریک کو تقویت ملی تھی جس میں مہدی افادی، سجاد حیدر یلدرم، سجاد انصاری، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپوری رومانی مضامین اور افسانے لکھا کرتے تھے۔

رومانی تحریک کے شعرا میں اقبال، جوش، اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری، مجاز اور ساغر نظامی اہم ہیں۔

رومانی نقادوں میں مہدی افادی، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، عبدالماجد دریابادی اور فراق گورکھ پوری ہیں۔

رومانوی تحریک سے وابستہ ادبا، شعرا اور ناقدین

محمد حسین آزاد	*	میر ناصر علی دہلوی	* عبدالحلیم شرر
شیخ عبدالقادر	*	اقبال	* ابوالکلام آزاد
سجاد حیدر یلدرم	*	آغا شاعر قزلباش	* ظفر علی خان
مرزا محمد سعید	*	خوشی محمد ناظر	* غلام بھیک نیرنگ
مہدی افادی	*	لطیف الدین احمد	* خواجہ حسن نظامی
سجاد انصاری	*	خلیق دہلوی	* حجاب امتیاز علی
امتیاز علی تاج	*	نیاز فتح پوری	* قاضی عبدالغفار
مجنوں گورکھپوری	*	میرزا ادیب	* ناصر نذیر فراق دہلوی
عشرت لکھنوی	*	چوہدری افضل حق	* چراغ حسن حسرت
فلک پیما	*	ل۔احمد اکبرآبادی	* خاں احمد حسین خاں
حکیم احمد شجاع	*	عابد علی عابد	* عظیم بیگ چغتائی
حفیظ جالندھری	*	عظمت اللہ خاں	* جوش ملیح آبادی
اختر شیرانی	*	علی اختر حیدرآبادی	* اختر انصاری
عابد اللہ اقسر	*	روش صدیقی	* ساغر نظامی
احسان دانش	*	الطاف مشہدی	* عبدالرحمٰن بجنوری
عبدالماجد دریابادی	*	فراق گورکھپوری	

Scanned with CamScanner

رومانیت اور منطق دونوں کے حاملین ناقدین

- رشید احمد صدیقی
- آل احمد سرور
- خورشید الاسلام
- ابواللیث صدیقی
- سید وقار عظیم
- عبادت بریلوی
- محمد اکرام

رومانوی تحریک سے وابستہ ادبا کے چند اہم اقوال

- تغزل میں تصوف کو شامل کر لینا ایک غزل گو شاعر کا کمال نہیں بلکہ اس کا عجز ہے۔ (نیاز فتح پوری)
- شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں۔ یہ مشہور بات ہے لیکن اگر شاعر اس نظریے پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بگڑ بھی جاتا ہے۔ (نیاز فتح پوری)
- شاعری انکشاف حیات ہے۔ جس طرح زندگی اپنی نمود میں محدود نہیں اسی طرح شاعری بھی اپنے اظہار میں لاتعین ہے۔ (عبدالرحمٰن بجنوری)
- سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتا۔ نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ تو چل سکتے ہیں لیکن آگے نہیں۔ اردو میں صرف آزاد ایسے انشا پرداز ہیں جن کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ (مہدی افادی)
- فرشتے کی انتہا یہ ہے کہ شیطان ہو جائے...... شیطنت ایک حیثیت انتقالی ہے اس لیے زیادہ محکم ہے...... انسان نہ حق ہے اور نہ باطل۔ اس کا وجود محض فریب کائنات ہے۔ (سجاد انصاری)
- ہر زمانے میں عورت کا مقیاس الشباب دائرہ حسن کا مرکز رہا ہے...... عورت وہی باکیف ہوگی جو لذت آشنا ہوگی...... سینہ کا حصہ افقی بالکل کھلا اور اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی کھینچ تان بتا رہی ہے کہ سرکشی لباس کی ممنون نہیں۔ (مہدی افادی)

(9) سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک

- نام سید احمد خان تھا اور خطاب جوادالدولہ عارف جنگ
- سرسید 5 ذوالحجہ 1233ھ مطابق 17 اکتوبر 1817 کو اپنے نانا خواجہ فرید کی حویلی واقع دلی میں پیدا ہوئے۔
- سرسید کا انتقال 27 مارچ 1898 کو علی گڑھ میں ہوا اور دارالعلوم کی مسجد کے شمالی گوشے کے احاطہ میں دفن ہوئے۔
- سرسید کا جب انتقال ہوا تو محسن الملک نے ان کے ملازم عظیم کو پچاس روپے دیے جن سے ان کی تجہیز و تکفین ہوئی اور کہا کہ یہ سید صاحب کا آخری چندہ ہے پھر کب مانگنے آئیں گے۔
- سرسید کے والد کا نام میر متقی تھا اور والدہ کا عزیز النسا بیگم
- نانا کا نام خواجہ فریدالدین تھا جنھیں مغلیہ دربار سے دبیرالدولہ امین الملک خواجہ فریدالدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کا خطاب ملا تھا۔
- سرسید کے دادا سید ہادی تھے۔ عزیز الدین عالمگیر ثانی نے 1168ھ میں انھیں ''جوادعلی خاں اور منصب ہزاری ذات و پانصد سوار دواسپہ وسہ اسپہ'' کے خطاب سے نوازا تھا اور شاہ عالم ثانی نے اس خطاب میں 'جوادالدولہ' کا اور اضافہ کیا تھا۔
- سرسید کے بڑے بھائی کا نام سید محمد خان تھا جنھوں نے 1836 میں سیدالاخبار نکالا تھا۔
- سرسید کے والد کا انتقال 1838 میں ہوا اس وقت سرسید اکیس سال کے تھے۔
- سرسید نے اسلامی تعلیم مولوی فیض الحسن مولوی نوازش علی اور مولانا مخصوص اللہ سے حاصل کی تھی۔
- سرسید کی شادی پرشا بیگم سے ہوئی تھی۔
- 1861 میں مرادآباد میں سید احمد خان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا اس وقت سید احمد خان کی عمر 44 برس تھی جن سے دو لڑکے سید حامد اور سید محمود اور ایک لڑکی تھی۔
- سرسید احمد خان نے منصفی کا امتحان 1840 میں پاس کیا تھا۔
- سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی' غازی پور میں 1862 میں قائم کی تھی اور ترجمے کا کام شروع کرایا تھا اور سرسید اس کے اعزازی سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔
- سرسید نے غازی پور میں ایک انگریزی مدرسہ 1863 میں قائم کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

- سرسید سائنٹفک سوسائٹی کا سارا سامان اور عملہ علی گڑھ 1864 میں لے گئے تھے۔
- سرسید نے 'علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن' 10 مئی 1866 میں قائم کیا تھا۔
- سرسید نے 'سائنٹفک سوسائٹی سے ہفتہ وار اخبار' کا اجرا علی گڑھ میں 1866 میں کیا تھا جس کا نام بعد میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا گیا تھا۔
- سرسید 15 اگست 1867 کو جج کی حیثیت سے جب علی گڑھ سے بنارس گئے تھے تو علی گڑھ میں سائنٹی فک سوسائٹی کی ساری ذمہ داری راجہ جے کشن ایس سی ایس آئی کے سپرد کی تھیں۔
- سرسید نے اردو کے ترسیلی امکانات اور اس کے ابلاغی قوتوں کا احساس دلایا تھا۔
- حکومت نے 1868 میں ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے 9 اسکالرشپ منظور کیے تھے اور اضلاع شمال مغرب سے سید محمود کا انتخاب کیا تھا۔
- سرسید نے بھی بیٹے کے ساتھ ولایت جانے کا ارادہ کیا۔ اپنے سفر خرچ و قیام کے لیے سرسید نے اپنا کتب خانہ فروخت کر دیا اور ساتھ ہی گھر کو بھی گروی رکھ دیا۔
- سرسید دفتر سے چھٹی لے کر چار افراد یعنی اپنے دونوں بیٹے سید حامد و سید محمود، خداداد بیگ اور خدمت گار چھجو کے ساتھ یکم اپریل 1869 کو بنارس سے انگلستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔
- سرسید نے انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ، ڈیوک، چارلس ڈکنز، کارلائل سے ملاقات کی تھی۔
- سرسید ایک سال پانچ ماہ یعنی سترہ مہینے لندن میں قیام کر کے 4 ستمبر 1870 کو ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے تھے۔
- سرسید 2 اکتوبر 1870 کو بمبئی پہنچے تھے اور اسی مہینے میں بنارس پہنچ کر اپنا سرکاری منصب سنبھال لیا تھا۔
- سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم دینے کی تیاری کے لیے کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان بنارس میں قائم کی تھی۔
- سرسید نے لندن ہی سے 'تدابیر ترقی تعلیم مسلمانان' کی اشاعت کے لیے ایک اشتہار چھپوا کر اپنے چلنے سے پہلے محسن الملک سید مہدی علی کو بھجوا دیا تھا۔
- سرسید نے انگلستان سے واپس ہونے کے بعد لوگوں کی اصلاح اور تہذیب و تربیت کے لیے اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے اخبار اڈیسن اور اسٹیل سے متاثر ہو کر تہذیب الاخلاق جاری کیا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' کا پہلا شمارہ 24 دسمبر 1870 کو بنارس سے اس لوح اور بیل کے ساتھ جو وہ لندن سے بنوا کر لائے تھے شائع ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

- 'تہذیب الاخلاق' کے ایڈیٹر اور منیجر سر سید احمد خان تھے۔
- 'تہذیب الاخلاق' تین بار بند ہوا تھا۔
- پہلی بار تہذیب الاخلاق 1876 میں بند ہوا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' کا دوبارہ اجرا 1879 میں ہوا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' دوبارہ بند 1881 میں ہوا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' کا تیسری بار اجرا 1894 میں ہوا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' تیسری بار بند ہو کر انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ضم 1897 میں ہوا تھا۔
- 'تہذیب الاخلاق' کی مخالفت میں مولوی امداد علی پیش پیش تھے جنھوں نے اس کے جواب میں امداد الآفاق نام کا رسالہ نکالا تھا۔
- تہذیب الاخلاق کے جواب اور رد میں مولوی علی بخش خان بہادر کے دو رسالے شہاب ثاقب اور تائید الاسلام، نور الآفاق، اسٹیچی گزٹ (مراد آباد)، لوح محفوظ (مراد آباد)، تیرہویں صدی (آگرہ)، نجم الاخبار، (مراد آباد)، اکمل الاخبار وغیرہ رسائل و اخبارات نکلے تھے۔
- دسمبر 1870 میں سر سید نے انعامی اشتہار شائع کیا تھا اور 26 دسمبر 1870 کو 'کمیٹی خواستگار ترقی مسلمان' کا پہلا اجلاس بلایا تھا جس میں سر سید سکریٹری منتخب ہوئے تھے۔
- سر سید نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد 1875 میں رکھی تھی اور 24 مئی 1875 کو ملکہ وکٹوریہ کی سال گرہ کے دن مدرسہ کا افتتاح ہوا تھا اور یکم جون 1875 سے تعلیم شروع ہوگئی تھی۔
- 8 جنوری 1877 کو سہ پہر کے وقت لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل الہند کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور ایک سال بعد یکم جنوری 1878 کو کالج میں کلاس شروع ہوئی تھی اس طرح مدرسۃ العلوم ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہو گیا۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا الحاق کلکتہ الہ آباد یونیورسٹی سے ہوا تھا۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج 1920 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا تھا۔
- سر سید 1876 میں پنشن لے کر علی گڑھ آ گئے تھے۔
- سر سید ایجوکیشن کمیشن کے رکن 1882 میں مقرر ہوئے تھے۔
- سر سید نے "محمڈن سول سروس فنڈ ایسوسی ایشن 1883 میں قائم کی تھی۔
- سر سید نے "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس 1886 میں قائم کی تھی۔
- سر سید کو لارڈ ڈفرن نے پبلک سروس کمیشن کا ممبر 1897 میں مقرر کیا تھا۔

(10) ترقی پسند تحریک

پس منظر، ابتدا اور اختتام

- ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز سجاد ظہیر اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں 1936ء میں ہوا تھا۔
- لیکن ترقی پسند تحریک کے قیام کا ابتدائی اعلان احمد علی، محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کے مشورے سے 1933ء میں کیا گیا تھا۔
- ترقی پسند تحریک حیدر آباد میں منعقد ہونے والی آٹھویں کل ہند کانفرنس کے بعد 1956 میں ختم کردی گئی تھی۔ (تخلیقی مصنف اور ترقی پسند مصنفین اثر احمد علی، سیپ کراچی، شمارہ 4)
- ترقی پسند تحریک کی گولڈن جوبلی، لندن، کراچی اور لکھنؤ میں 1986 میں منعقد کی گئی تھی۔

(اردو ادب کی مختصر تاریخ از انور سدید، صفحہ 428)

- دسمبر 1932ء میں شائع ہونے والے افسانوی مجموعے 'انگارے' کو ترقی پسند تحریک کا نقطۂ آغاز کہا جاسکتا ہے۔

انگارے

- افسانوی مجموعہ 'انگارے' احمد علی (دو افسانے)، سجاد ظہیر (پانچ)، رشید جہاں (دو افسانے) اور محمود الظفر (ایک افسانہ) کے دس افسانوں کا مجموعہ ہے۔
- یہ نوجوان مصنف (انگارے میں لکھنے والے افسانہ نگار) زندگی کی بے کیفی اور یک رنگی سے گھبرائے اور جذباتی انقلابی تصورات سے بھرے ہوئے تھے۔ (احتشام حسین)
- انگارے کی بیشتر کہانیوں میں سنجیدگی اور ٹھہراؤ کم اور سماجی رجعت پرستی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ تھا۔ (سجاد ظہیر)
- عزیز احمد نے 'انگارے' کو سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ قرار دیا ہے۔
- عزیز احمد کے مطابق انگارے کی اشاعت سے نئے ادب نے خود مختاری کا علم بلند کیا۔
- نیاز فتح پوری اور عبدالماجد دریابادی نے انگارے کی مخالفت میں مضامین لکھے تھے۔
- انگارے کو مارچ 1933ء میں ضبط کیا گیا تھا۔
- ترقی پسند تحریک کو اولین فکری اساس اختر حسین رائے پوری کے مقالہ 'ادب اور زندگی' نے فراہم کی تھی جس میں گورکی اور ٹالسٹائی کے خیالات کو اردو داں طبقے میں متعارف کرانے کی کاوش کی گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

مضمون ادب اور زندگی رسالہ اردو میں جولائی 1935 میں شائع ہوا تھا۔

- یورپ کی یونیورسٹیوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے جن ہندوستانی طلبہ نے جرمنی کے ہٹلر کے فاشزم کی مخالفت کی تھی ان طلبہ کی جماعت نے ایک ادبی حلقے کی شکل 1935ء میں اختیار کی تھی۔
- اس ادبی حلقے میں اردو کے ادیب سجاد ظہیر اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر، انگریزی زبان کے ادیب اور ناول نگار ملک راج آنند، بنگالی کے ادیب ڈاکٹر جیوتی گھوش اور پرمود سین گپتا شامل تھے۔
- ان طلبہ نے ہندوستانی ادیبوں کی ایک انجمن بنانے کے خیال سے پہلا باقاعدہ جلسہ لندن کے نانکنگ ریسٹوراں میں کیا تھا اور اس انجمن کا نام 'ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں کی انجمن' (Indian Progressive Writter's Association) رکھا تھا۔
- اس انجمن کی تشکیل کے لیے باقاعدہ ایک مینی فسٹو (منشور) لندن ہی میں تیار کیا گیا تھا۔
- ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کے صدر ملک راج آنند منتخب ہوئے تھے۔
- ترقی پسند تحریک میں سجاد ظہیر کا نام اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ اس تحریک کا عروج ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا مرہون منت ہے۔
- ترقی پسند تحریک اردو ادب کی اولین تحریک تھی جس کے لیے ایک باضابطہ منشور (منی فسٹو) تحریر کیا گیا تھا۔
- لندن میں ہندوستانی ترقی پسند ادیبوں نے اپنی تحریک کا جو پہلا مینی فسٹو (منشور) تیار کیا تھا اس پر ڈاکٹر ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر جیوتی گھوش، ڈاکٹر کے۔ ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس۔ سنہا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر کے دستخط تھے۔
- لندن میں انجمن کے ایک جلسے میں ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی (ماہر لسانیات) نے شرکت کی تھی اور رومن رسم الخط کی حمایت میں ایک تقریر کی تھی۔

مقصد

- اس پہلے مینی فسٹو میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا مقصد یہ درج ہے کہ "اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر عوام سے قریب تر لایا جائے۔ انھیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں۔ ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی و تنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے

Scanned with CamScanner

ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔

- ان جیسے مقاصد کو سامنے رکھ کر انجمن ترقی پسند مصنفین نے مندرجہ ذیل تجاویز پاس کی تھیں:

(1) ہندوستان کے مختلف لسانی صوبوں میں ادیبوں کی انجمنیں قائم کرنا۔ ان انجمنوں کے درمیان اجتماعی اور پمفلٹوں وغیرہ کے ذریعے ربط و تعاون پیدا کرنا، صوبوں کی، مرکز کی اور لندن کی انجمنوں کے درمیان قریبی تعلق پیدا کرنا۔

(2) ان ادبی جماعتوں سے میل جول پیدا کرنا جو اس انجمن کے مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔

(3) ترقی پسند ادب کی تخلیق کرنا اور ترجمہ کرنا جو صحت مند اور توانا ہو۔ جس سے ہم تہذیبی پسماندگا کو مٹا سکیں اور ہندوستانی آزادی اور سماجی ترقی کی طرف بڑھ سکیں۔

(4) ہندوستان کو قومی زبان اور انڈورومن رسم الخط کو قومی رسم الخط تسلیم کرنے کا پرچار کرنا۔

(5) فکر و نظر اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا۔

(6) ادیبوں کے مفاد کی حفاظت کرنا، عوامی ادیبوں کی مدد کرنا جو اپنی کتابیں طبع کرانے کے لیے امداد چاہتے ہوں۔

انجمن کے متعلق اہم معلومات

- اس پہلے مینی فیسٹو کو ہندوستان میں پریم چند نے سب سے پہلے خوش آمدید کہا تھا۔
- پریم چند نے اس مینی فیسٹو کو اپنے رسالہ 'ہنس' میں شائع کر کے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں ان مقاصد کی حمایت کی تھی اور کہا تھا کہ یہ ہمارے ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہے۔
- لندن کی انجمن نے اپنا جو مینی فسٹو تیار کیا تھا اسے سائیکلو اسٹائل کر کے سجاد ظہیر نے ہندوستان میں اپنے دوستوں ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر محمود الظفر، رشید جہاں، پروفیسر ہیرن مکرجی اور احمد علی کو بھیج کر ان کی رائے دریافت کی تھی۔
- 1935 میں سجاد ظہیر کے ہندوستان واپس آنے کے بعد الہ آباد میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین، ہندی کے ادیب شیودان سنگھ چوہان اور نریندر شرما، احتشام حسین اور سید وقار عظیم نے سجاد ظہیر کے منصوبے کی تائید کی تھی۔
- دسمبر 1935 میں الہ آباد میں مولوی عبدالحق، منشی پریم چند اور جوش ملیح آبادی نے سجاد ظہیر کے کہنے پر انجمن کے مقاصد سے اتفاق کیا تھا اور انجمن کے مینی فیسٹو پر اپنے دستخط کیا تھا۔

Scanned with CamScanner

(11) حلقۂ اربابِ ذوق

- حلقۂ ارباب ذوق (مجلس داستان گویاں) کا قیام ترقی پسند تحریک کے قیام کے تقریباً تین سال بعد یعنی 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں سید نصیر احمد جامعی کے گھر پر عمل میں آیا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کو بالعموم ایک دوسرے کی ضد قرار دیا جاتا ہے۔
- سید نصیر احمد جامعی نے 29 اپریل 1939 کو اپنے گھر پر چند دوستوں یعنی نسیم حجازی، تابش صدیقی، حفیظ ہوشیار پوری، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید، عبدالغنی اور شیر محمد اختر وغیرہ کو جمع کر کے ایک ادبی محفل منعقد کی تھی اور اس محفل میں ایک ایسی مجلس کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا تھا جس میں افسانے پڑھے جائیں اور ان پر جدید مغربی تنقید کی روشنی میں تنقید کی جایا کرے اور اس مجلس کا نام ''مجلس داستان گویاں'' رکھا گیا تھا۔
- یاد رہے کہ حلقۂ ارباب ذوق کا ابتدائی نام مجلس داستان گویاں تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدائی نوشستیں 'مجلس داستان گویاں' نام کے تحت ہی منعقد ہوئی تھیں۔
- 2 ستمبر 1939ء کو منعقد ہونے والے دسوے جلسے میں 'مجلس داستان گویاں' کا نام تبدیل کر کے 'حلقۂ ارباب ذوق' حفیظ ہوشیار پوری کی تجویز پر رکھا گیا تھا۔
- ڈاکٹر محمد باقر نے نے مخزن اگست 1950ء ص 95 پر شائع ہونے والے مضمون میں لکھا ہے کہ ''سب لوگ متقاضی تھے کہ 'لٹریری سرکل' نام رکھا جائے..... لٹریری سرکل کا لغوی ترجمہ 'ادبی حلقہ' ہوتا ہے..... ہم سب نے حلقہ کا لفظ بار بار دہرایا اور بالآخر یہ ہمارے حلق سے نیچے اتر گیا۔ اور میری تجویز پر حلقۂ ارباب ذوق نام طے پایا گیا۔
- نوٹ: محمد باقر کے اس بیان کو ''ان کی تجویز پر نام رکھا گیا۔'' قیوم نظر نے درست قرار نہیں دیا ہے۔
- مجلس داستان گویاں کا مقصد کسی نئی تحریک کو وجود میں لانا اور ادب میں موضوع یا ہیئت کا کوئی نیا انقلاب بپا کرنا نہیں تھا بلکہ اس مجلس کی نوعیت تقریب ملاقات کی تھی۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی شاخ دہلی میں قائم کی گئی تھی جس کے معتمد ڈاکٹر عبادت بریلوی مقرر ہوئے تھے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں نے اپنی مجلسوں کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو ملحوظ رکھنے کی تاکید کی تھی۔

Scanned with CamScanner

* حلقۂ ارباب ذوق کا کوئی مستقل صدر نہیں ہوگا
* حلقۂ ارباب ذوق کا صرف ایک مستقل سکریٹری ہوگا۔
* رکن بننے کے لیے کوئی چندہ یا فیس نہیں لی جائے گی۔
* ہر سال کے لیے ایک سکریٹری چنا جائے گا۔
* حلقے کی رکنیت محدود رکھی جائے گی اور حلقہ کے ارکان کو اختیار ہوگا کہ جس کو چاہیں حلقے کا رکن بنائیں لیکن حلقے کے اجلاس اس مرد اور عورت کے لیے کھلے ہوں گے جس کو اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے گی۔
* حلقے کا جلسہ ہر ہفتے ایک رکن کے مکان پر ہوگا جس کے ذمے سب کو چائے پلانا ہوگا۔
* حلقے کی ہر نشست میں کچھ مضامین اور نظمیں پڑھی جائیں گی جن کو سننے کے بعد ان پر بے لاگ تنقید کی جائے گی اور مضمون نگار یا شاعر کا فرض ہوگا کہ وہ ناراض ہونے کے بجائے خوش دلی سے ناقدین یا معترضین کی تنقید و اعتراض کو سنے اور اس کا جواب دے۔
* حلقہ کی کارروائی کو حتی الوسع مشتہر نہیں کیا جائے گا۔

- حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں سید نصیر احمد جامعی، حفیظ ہوشیار پوری، شیر محمد اختر، تابش صدیقی، محمد افضل اور نسیم حجازی وغیرہ شامل ہیں۔
- ابتداً حلقہ اور ارباب ذوق کے جلسے ارکانِ حلقہ کی رہائش گاہوں پر ہر اتوار کو ہوا کرتے تھے۔ 1944 سے ارکان حلقہ کے گھروں کے بجائے ایم سی اے ہال میں منعقد ہونے لگے تھے۔
- پہلا جلسہ نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ پر منعقد ہوا تھا اور اس کی صدارت حفیظ ہوشیار پوری نے کی تھی جس میں پہلا افسانہ 'تلافی' نسیم حجازی نے تنقید کے لیے پیش کیا تھا۔
- قیوم نظر اور یوسف ظفر اگرچہ حلقہ کے بانیوں میں سے نہیں تھے لیکن وہ اہم رکن تھے جن کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد شاعری اور شاعری کی تنقید کو بھی حلقہ میں جگہ ملی تھی۔
- مولانا صلاح الدین احمد حلقے سے ادبی وابستگی کے ساتھ ساتھ اس کی انتظامیہ کے رکن بھی تھے۔
- حلقہ کے ریکارڈ کے مطابق میراجی نے سب سے پہلے 25 اگست 1940ء کو حلقہ کے جلسے میں قیوم نظر کی دعوت پر شرکت کی تھی۔
- یاد رہے کہ میراجی بھی حلقۂ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے نہیں تھے لیکن چوں کہ میراجی کی وجہ سے حلقہ کو ایک واضح ادبی رجحان ملا اس لیے حلقۂ ارباب ذوق کا نام لیتے ہی میراجی کا نام آجاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

میراجی اور حلقے سے متعلق چند اہم اقوال

- قواعد و ضوابط کی تنظیم اور پروگراموں کی تشکیل سب کے پس پشت میراج ایک محرک قوت کے طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ (محمود نظامی مقالہ میراجی نقوش، شخصیات نمبر ص 591)
- ان (میراجی) کی آمد سے حلقے میں نئی روح پیدا ہوگئی۔ (شیر محمد اختر)
- نوجوانوں کی اس مجلس میں میراجی کی حیثیت پیر مغاں کی سی تھی۔ (محمود نظامی)
- یوسف ظفر نے جلسے کے اختتام پر پڑھی جانے والی نظموں اور غزلوں کے تفریحی پہلو کو ختم کیا اور مضامین کی طرح شاعری پر بھی تنقیدی بحث کی ابتدا کی تھی۔
- شیر محمد اختر حلقے کے ساتھ تادم زندگی وابستہ رہے۔ ان کا میدان افسانہ نگاری ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کے نزدیک تجربہ، جدت اور انفرادیت فن کے لیے بنیادی چیزیں ہیں۔
- فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقۂ ارباب ذوق نے معاشرہ کے مقابلے میں فرد اور ذات کو اہمیت دی ہے۔
- حلقہ نے تجربے پر اس شرط کے ساتھ زور دیا ہے کہ تجربہ نیا ہو۔
- حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا ہے۔
- حلقہ کے فن کاروں کے نزدیک اچھا ادب وہ ہے جو اپنے ماحول کا عکاس و ترجمان بھی ہو اور جس میں روایات کی پاس داری بھی موجود ہو۔
- ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں حلقہ کے شاعروں کے یہاں احساس ذات شدید ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی ابتدا افسانہ خوانی سے ہوئی تھی۔
- میراجی نے حلقے کا رخ تنقید کی طرف موڑا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق نے نئی نظم کو فروغ دینے میں قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں
- حلقۂ ارباب ذوق کے تخلیقی عمل میں اخفا، ابہام اور بعد کو اہمیت حاصل ہے جب کہ تنقید میں حلقہ نے ابہام کے برعکس بے رحم تجزیہ کو اہمیت دیا ہے۔
- حلقۂ ارباب ذوق نے ترقی پسند تحریک کے 'ادب برائے زندگی' کے مقابلے میں 'ادب برائے ادب' کا نعرہ بلند کیا تھا۔
- حلقۂ ارباب ذوق کی تنقیدی جہت کو متعین کرنے کا فریضہ میراجی نے سرانجام دیا تھا۔
- میراجی کا خیال ہے کہ داخلی اور خارجی فنی اصول سے قطع نظر ادب ہر مصنف کی اپنی شخصیت کا

(12) جدیدیت

- 1960 کے آس پاس جدیدیت کا رجحان سامنے آیا تھا۔
- جدیدیت جو ایک رجحان یا رویہ ہے اس کا خمیر وجودیت اور تجریدیت سے تیار ہوا تھا۔
- جدیدیت کسی ایک نظریے تک محدود نہیں ہے بلکہ یورپی مفکرین اور فلسفیوں کے مختلف النوع تصورات اور نظریوں پر مبنی ہے جیسے معرفت پسندی، انفرادیت پسندی، ماورائے حقیقت پسندی، ماورائیت، انکاریت، پیکریت، تاثریت، عملیت، مزاجیت، لایعنیت، شعور کی رو، تحت الشعور، لاشعور اور وجودیت
- 1960 کے لگ بھگ جدید ذہن کے ادیبوں نے ترقی پسند مصنفین کی جماعت بندی اور نظریاتی وابستگی کے خلاف آواز بلند کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ ادیب کی وابستگی مخصوص سیاسی جماعت یا نظریے سے نہیں بلکہ اپنی ذات سے ہونی چاہیے۔
- جدیدیت لفظ جدید سے مشتق ایک ادبی اصطلاح ہے اس کا اطلاق 1957 کے بعد کے ادب پر ہوتا ہے۔
- جدیدیت کی ایک پہچان علامتی اور اشاراتی اسلوب ہے۔
- جدیدیت کی جڑیں، وجودیت کے فلسفے سے ملتی ہیں۔ وجودیت کا فلسفہ انسان کی داخلیت کے ارتقا کو پیش کرتا ہے۔
- فلسفۂ وجودیت میں ساری باتوں کی بنیاد فرد کا شعور ذات ہے۔
- وجودیت کے فلسفے کو سمت و رفتار عطا کرنے میں کانٹ، ہیگل، دیوڈ ہیوم اور سارتر کا اہم حصہ ہے۔
- وجود کی عام تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کا کسی زمانے میں کسی جگہ پر ہونا یہ اس شے کے وجود سے عبارت ہے۔ وجودیت پسند مفکرین اس تعریف کو رد کرتے ہیں ان کے نزدیک وجود سے مراد ہر لمحہ کچھ ہوتے رہنا کچھ بنتے رہنا۔ وجود کا مفہوم 'یہ ہے' ہو ہی نہیں سکتا بلکہ ہو رہا ہے، بن رہا ہے بننے کا عمل جاری ہے۔
- وجودیت کا فلسفہ صرف آدمی یا فرد سے بحث کرتا ہے۔ وہ بھی منفرد آدمی سے۔
- جدیدیت پسند زبان، اسلوب اور تکنیک کو معانی اور موضوع سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔
- جدیدیت پسند لکھنے والے غیر مربوط، غیر منطقی اور Non linear بیانیہ کا استعمال کرتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

(13) مابعد جدیدیت

- جدیدیت کے بعد کا دور مابعد جدیدیت کہلاتا ہے۔
- مابعد جدیدیت نہ ترقی پسندی کی ضد ہے اور نہ جدیدیت کی۔
- گوپی چند نارنگ کے لفظوں میں مابعد جدیدیت کسی ایک وحدانی نظریے کا نام نہیں بلکہ مابعد جدیدیت کی اصطلاح احاطہ کرتی ہے مختلف بصیرتوں اور ذہنی رویوں کا، جن سب کی تہہ میں بنیادی بات تخلیق کی آزادی اور معنی پر بیٹھائے ہوئے پہرے یا اندرونی اور بیرونی دی ہوئی لیک کو رد کرنا ہے۔
- مابعد جدیدیت تخلیق کی آزادی اور تکثیریت کا فلسفہ ہے جو مرکزیت یا وحدیت یا کلیت پسندی کے مقابلے پر ثقافتی بوقلمونی، مقامیت، تہذیب حوالے اور معنی کے دوسرے پن The other کی تعبیر پر اور اس تعبیر میں قاری کی شرکت پر اصرار کرتا ہے۔
- یاد رہے کہ تکثیریت، بے مرکزیت، بھرپور تخلیقیت، رنگارنگی، بوقلمونی، غیر یکسانیت اور مقامیت، بمقابلہ کلیت پسندی و آمریت مابعد جدیدیت کے نمایاں خصائص ہیں۔
- مابعد جدیدیت کسی بھی نظریے کو حتمی اور مطلق نہیں مانتی۔ یہ سرے سے نظریہ دینے کے خلاف ہے۔ ہر نظریہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے استبدادی ہوتا ہے، اس لیے تخلیقیت اور آزادی کے منافی ہے۔
- مابعد جدیدیت ہر طرح کی کلیت پسندی اور فارمولا سازی اور ضابطہ بندی کے خلاف ہے اور اس کے مقابلے پر مخصوص اور مقامی پر نیز کھلے ڈلے فطری بے محابا اور آزادانہ اظہار و عمل پر اصرار کرتی ہے۔
- مابعد جدیدیت ادب فریب معنی کو مسترد کرتا ہے اور متن کی کائنات کو ہی مسلم حقیقت سمجھتا ہے۔
- مابعد جدیدیت متنی تفاعل کو اہمیت دیتی ہے اور متن کو ہی حقیقت جواز حقیقت سمجھتی ہے۔
- مابعد جدیدیت ادب اور فوق ادب کے درمیان کسی طرح کا امتیاز نہیں برتتی
- مابعد جدیدیت ادب کے مطابق اپنے تجربات میں ہم جو بھی معنی با معنی پیکر دیکھتے ہیں وہ فکشن ہیں۔
- مابعد جدیدیت فوق متن کو تخلیق کرتی ہے اور ادب میں خواہ وہ شاعری ہو یا فکشن فوق افسانوی (Meta Fictional) پہلو پر اصرار کرتی ہے۔

Scanned with CamScanner

- مابعد جدیدیت کی ادبی اور ثقافتی اصطلاح حتمی طور پر جدیدیت کے خلاف کسی ردعمل کو سامنے نہیں لاتی بلکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ جدیدیت کے زیر اثر ابھرنے والے بعض رویوں نے جو ادب تخلیق کیا وہ بھی بعد میں مابعد جدید کہلایا۔ (ابوالکلام قاسمی)
- مابعد جدیدیت میں بین المتونیت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔
- مابعد جدیدیت کے نزدیک متن نہ صرف یہ کہ قائم بالذات ہے اس لیے فی نفسہ اپنا جواز بھی ہے۔
- فکشن نگار بورخیس کے مطابق مابعد جدیدیت ایسا متن تیار کرتی ہے جو ترجیحی طور پر ماقبل کے کسی نہ کسی متن کی تفسیر، اور اس پر تبصرے کی حیثیت رکھتا ہو۔
- مابعد جدید تصور ادب مقامیت اور تہذیبی حوالے کو 'متن کا لازمی سرچشمہ' قرار دیتا ہے۔
- بقول قاضی افضال حسین پیروڈی مابعد جدید افسانہ کی بنیادی صفت ہے۔
- متن کی Self Reflexivity مابعد جدید تنقیدی تصور ہے۔
- ما عبد جدید افسانے کا پورا رویہ انحراف سے زیادہ انجذاب کا عکاس ہے۔
- مابعد جدید افسانے کی ابتدا 1970ء کے آس پاس ہوئی تھی۔
- بالعموم مابعد جدید مفکرین کا رویہ ہے:

"If marx isn't true, then nothing is"

مابعد جدید مفکرین کا کلیت پسندی، مرکزیت یا سسٹم کے خلاف ہونا، نیز کثیر المعنویت، کثیر الوضعیت، مقامیت، بوقلمونی یا سب سے بڑھ کر تخلیقیت پر اصرار کرنا اسی راہ سے ہے۔ (گوپی چند نارنگ)

- مابعد جدیدیت پر مغربی ادیبوں میں سے سوسیئر، وٹگنسٹائن، لاکاں، رولاں بارتھ، میشیل فوکو اور ژاک دریدا وغیرہ نے سب سے زیادہ اثر ڈالا۔
- گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا مابعد جدیدیت کے سب سے بڑا حمایتی ہیں۔
- فضیل جعفری مابعد جدیدیت اور گوپی چند نارنگ کے سخت مخالف رہے ہیں۔
- گوپی چند نارنگ کی کتاب 'ساختیات پس ساختیات اور مشرقی شعریات' مابعد جدید تنقیدی تصورات کا مستند اور جامع تعارف پیش کرتی ہے۔
- مابعد جدیدیت کا سہ روزہ کل ہند سب سے پہلا سمینار مارچ 1997ء میں دہلی اردو اکادمی کے زیر اہتمام انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی میں گوپی چند نارنگ نے منعقد کرایا تھا۔

Scanned with CamScanner

مابعد جدیدیت سے وابستہ ناول نگار

- الیاس احمد گدی * عبدالصمد * حسین الحق * مشرف عالم ذوقی
- سید محمد اشرف * صلاح الدین پرویز * علی امام نقوی * سلیم شہزاد
- شموئل احمد * عشرت ظفر * جتیندر بلو * غضنفر
- احمد داؤد * اطہر نیاز * انور سین رائے * ظفر پیامی
- اکرام اللہ

مابعد جدیدیت سے وابستہ افسانہ نگار

- غیاث احمد گدی * انور خان * سلام بن رزاق * انور قمر
- خالد جاوید * ساجد رشید * طارق چھتاری * سید محمد اشرف
- رضا امام * ابن کنول * مقدر حمید * م ناگ

مابعد جدیدیت سے وابستہ تنقید نگار

- گوپی چند نارنگ * وزیر آغا * نظام صدیقی * فہیم اعظمی
- حامدی کاشمیری * قمر جمیل * ضمیر بدایونی * قاضی افضال حسین
- ابوالکلام قاسمی * آصف فرخی * انیس اشفاق * عقیل احمد
- خورشید احمد

Scanned with CamScanner

15.2 فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد

فورٹ ولیم کالج کا قیام انگریز عہدے داروں کو اردو سکھانے کے لیے عمل میں آیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اسی بات کو بڑی وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

> ''ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا اصل منشا کلکتہ میں چند ارباب قلم کو یکجا جمع کر کے ان سے اپنے انگریز اہل کاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفوں کو اس بات کا بہت کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے ارباب اقتدار کو ضروری نصابی کتب کی تیاری میں عجلت تھی۔ اس لیے ان مصنفوں سے بجائے مستقل کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور' متبادل اور بالخصوص فارسی کی عام پسند کتابوں کے ترجمے کرائے گئے''۔ (پیش لفظ ''ارباب نثر اردو'')

فورٹ ولیم کالج میں جو کتابیں تیار ہوئیں وہ ایسے لوگوں کے لیے تھیں جو اردو زبان سیکھنا چاہتے ہوں۔ اردو میں مبتدیوں کے پڑھنے کے لیے کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی ضرورت یوں پیش نہیں آتی تھی کہ ابتدائی تعلیم فارسی اور عربی میں ہوا کرتی تھی۔ فارسی رسم خط سے جو واقف ہو جاتا تھا وہ اردو آسانی سے لکھ پڑھ سکتا تھا۔ اردو عام بول چال کی زبان تھی اور یہی مادری زبان بھی ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج میں نہ صرف سادہ اور سلیس زبان میں کتابیں تیار کی گئیں بلکہ اردو قواعد کی کتابیں اور لغات بھی تیار کی گئیں۔ خود اردو کے پروفیسر اور صدر جان گلکرسٹ نے یہ کام انجام دیا۔ جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ اردو میں جو نثری کتابیں تھیں وہ بہت ادق زبان میں تھیں اور مقفیٰ و مسجع بھی ہوا کرتی تھیں۔ مبتدیوں کے لیے یہ کتابیں قطعی غیر موزوں تھیں۔ چند کتابیں ضرور ایسی تھیں جن کی زبان آسان تھی لیکن ایسی کتابیں تمام تر مذہبی تھیں۔ ان کتابوں کا موضوع اسلامی تعلیمات اور عقائد تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ اور دوسرے علمی موضوعات پر اردو میں کتابیں نہیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی اور ادبی کاموں کے لیے ایک مدت تک فارسی ہی استعمال کی جاتی تھی۔ اس بات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اردو کے بڑے بڑے شاعروں نے اردو شعرا کے جو تذکرے لکھے وہ فارسی میں لکھے گئے۔ میر تقی میر نے اپنا تذکرہ ''نکات الشعرا'' فارسی ہی میں لکھا۔ مصحفی نے کئی تذکرے جیسے ریاض الفصحا'' تذکرۂ ہندی گویاں عقد ثریا تمام کے تمام تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ اسی طرح میر حسن اور قائم چاند پوری نے بھی اردو شعرا کے تذکرے فارسی ہی میں لکھے۔ میر نے اپنی آپ بیتی ''ذکر میر'' فارسی ہی میں لکھی۔ غالب نے مغلیہ سلطنت کی تاریخ ''مہر نیم روز'' اور ''ماہِ نیم ماہ'' کے نام سے لکھی تو فارسی ہی میں لکھی۔ غرض یہ کہ تمام علمی اور ادبی کام فارسی ہی میں ہوا کرتے تھے۔ اسی لیے اردو نثر میں کتابیں بہت کم تعداد میں ملتی ہیں۔ اسی وجہ سے فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھوائی گئیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور سلیس اردو زبان میں کتابیں لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ بیان کیجیے۔
2. فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کیجیے۔

15.3 ڈاکٹر جان گل کرسٹ

گل کرسٹ کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ (John Barth Wick Gilchrist) تھا وہ پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی میں وہ ڈاکٹر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور ہندوستان آئے۔ ہندوستان آئے تو انہوں نے فارسی اور اردو سیکھنی شروع کی اور یہ زبانیں سیکھنے کے لیے انہوں نے ہندوستانی لباس اختیار کیا اور اردو زبانوں کے مرکز دہلی اور لکھنؤ میں رہ کر فارسی اور اردو سیکھی۔ کمپنی کی طرف سے بھی

ہندوستانی زبانیں سیکھنے کے لیے ترغیب دی جاتی تھی یعنی تیس روپے الاؤنس دیا جاتا تھا۔ ڈاکر گل کرسٹ نے اردو زبان سیکھنے میں خصوصی دلچسپی لی۔ انہوں نے کمپنی کو مطلع کیا کہ اب فارسی کو دفتری زبان بنائے رکھنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اردو کو دفتری زبان بنانا زیادہ مفید ہوگا۔ بعد میں 1832ء میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ گو اس وقت تک گل کرسٹ اپنے وطن لندن روانہ ہو چکے تھے لیکن ان کی تجویز پر عمل کیا گیا۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے گل کرسٹ نووارد انگریز عہدے داروں کو فارسی کی تعلیم دیا کرتے تھے اور بغیر کسی معاوضے کے انہیں نوشت و خواند کے قابل بنا کر دیا کرتے تھے۔ جب لارڈ ولزلی گورنر جنرل بن کر جب ہندوستان آئے تو انہوں نے کمپنی کے ملازمین کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر ایک کالج کے قیام کی سفارش کی لیکن کمپنی کے دوسرے عہدے داروں نے بڑی کاٹ چھانٹ کے بعد ایک کالج کے قیام کی منظوری دی۔ 1800ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتے میں قائم ہوا۔ گل کرسٹ کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں کالج کا صدر اور پروفیسر بنایا گیا۔ گل کرسٹ صرف چار سال تک ہی کالج کی خدمات انجام دیتے رہے اور خرابیٔ صحت کی وجہ سے اپنے وطن لندن لوٹ گئے۔ لیکن ان چار سالوں میں انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں تمام ہندوستان سے قابل اور لائق ماہرین زبان کو جمع کر دیا اور ان سے تصنیف و تالیف کا کام ان سے اس طرح لیا کہ ان کے جانے کے بعد بھی فورٹ ولیم کالج کے ماہرین زبان تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے خود انگلستان میں جب ادارۂ شرقیہ Oriental Institute قائم کیا تو گل کرسٹ کو اردو کی پروفیسری پر معمور کیا۔ اس ادارہ میں صرف ان کو تعلیم دی جاتی تھی جو طبی عہدے پر فائز ہو کر ہندوستان جاتے تھے۔ وہ اس ادارے میں 1825ء تک یعنی اس ادارے کے برخاست ہونے تک کام کرتے رہے۔ بعد میں وہ اپنے طور پر کمپنی کے امیدواروں کو اردو پڑھاتے رہے۔ 88 سال کی عمر میں 1841ء میں گل کرسٹ کا انتقال ہوا۔

گل کرسٹ کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے 1787ء سے شروع ہوتا ہے۔ اسی سال انہوں نے انگریزی ہندوستانی لغت تیار کرنی شروع کی۔ وہ تقریباً تیس سال تک تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ انہوں نے حسب ذیل کتابیں لکھی تھیں:

1. انگریزی ہندوستانی لغت: وہ کوئی نو سال تک مسلسل اس لغت کو تیار کرنے میں لگے رہے۔ ہر لفظ کی اصل اس لغت میں بتائی گئی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ یہ لغت 1792ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی۔
2. ہندوستانی علم اللسان: یہ اردو لسانیات پر کتاب ہے۔ آخر میں انگریزی سے اردو اور اردو سے انگریزی کی ایک فرہنگ دی گئی ہے۔ مقدمہ میں اردو قواعد زبان کو پیش کیا گیا ہے۔
3. اردو کی صرف و نحو: اردو قواعد کی یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں شامل تھی۔ میر بہادر علی حسینی نے ''اردو رسالہ گل کرسٹ'' کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا۔
4. مشرقی زبان داں: اردو زبان سیکھنے کا آسان طریقہ پیش کیا گیا ہے۔ اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو کی فرہنگ بھی شامل ہے۔ آلات جنگ کے اردو نام بھی دیئے گئے ہیں اور زبان کے ابتدائی مسائل سے بحث کی گئی ہے۔
5. اردو زبان پر مختصر مقدمہ: ''یہ مشرقی زبان داں'' کا خلاصہ ہے۔
6. ہندی کی آسان مشقیں: فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اور آخری امتحانات کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔
7. فارسی افعال کا جدید نظریہ فارسی افعال کی تشریح کی گئی ہے۔ افعال کے اردو اور انگریزی مترادفات بھی دیے گئے ہیں۔
8. اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو: انگریزوں کو اردو سکھانے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی۔
9. بیاض ہندی: فورٹ ولیم کالج کے مولفین کے کارناموں کا انتخاب۔
10. عملی خاکے: اس میں اردو الفاظ کی قرأت اور ان کے صحیح تلفظ کے اصول پیش کیے گئے ہیں۔
11. ہندی الفاظ کی قرأت۔ اس میں ہندی الفاظ کی قرأت کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔
12. اتالیق ہندی: اردو نوشت و خواند آسانی سے سیکھنے کے طریقے۔ اس میں فارسی سیکھنے والوں کی بھی رہنمائی کی گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

13. ہندی عربی آئینہ: اس میں عربی کے ایسے الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جن کا اردو سے گہرا تعلق ہے۔
14. مکالمات انگریزی و ہندوستانی: اہل یورپ کو بول چال سکھانے اور ہندوستانیوں کے ساتھ روزمرہ کی گفتگو کرنے کے طریقے سکھائے گئے ہیں۔
15. مشرقی قصے: اس میں حکایات لقمان اور دوسرے مشرقی قصے اور افسانے فارسی، برج بھاشا اور سنسکرت سے ترجمہ کر کے یکجا کیے گئے ہیں۔ ان کے ترجموں میں گل کرسٹ کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کے دوسرے اہل قلم نے بھی حصہ لیا ہے۔
16. ہندی داستاں گو: اس میں فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے اردو میں استعمال کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

مذکورہ بالا گل کرسٹ کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ اردو سیکھنے کے لیے جن بنیادی کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے اس کو پورا کرنے کی انہوں نے کوشش کی۔ قواعد زبان اور تدوین لغت کا کام گل کرسٹ نے سب سے پہلے کیا۔ اردو سیکھنے کے لیے بنیادی کتابوں کا جتنا اور جیسا ذخیرہ انہوں نے فراہم کیا وہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔

15.4 اردو کے دوسرے انگریز پروفیسران

ڈاکٹر گل کرسٹ کے انگلستان لوٹنے کے بعد کپتان ٹامس روبک (Captain Thomas Roobuck) اردو کے پروفیسر اور صدر مقرر ہوئے۔ ان کا تعلق فوج سے تھا۔ گل کرسٹ کی وجہ سے انہیں اردو کا شغف پیدا ہوا۔ انہوں نے کالج کے اہل قلم کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کیا اور کئی کتابیں شائع کیں۔ ان کو شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ بنی نارائن جہاں کو خاص طور پر تصنیف و تالیف پر آمادہ کیا۔ اور ان سے اردو شعرا کا تذکرہ لکھوایا۔ گل کرسٹ نے ''ہندوستانی لغت'' کی تدوین کی تو اس میں وہ شریک رہے۔ انہوں نے بھی کئی کتابیں لکھیں۔ ''لغت جہاز رانی'' کے عنوان سے لغت لکھی۔ اس کے ساتھ ایک مختصر اردو قواعد بھی شامل کی۔ ان کی دوسری کتاب '' ترجمان ہندوستان '' (Hindustan Interpreter" ہے۔ اس میں بھی قواعد زبان کی تشریح کی گئی ہے۔ ان اردو کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی تاریخ بھی انہوں نے لکھی ہے۔

کپتان جوزف ٹیلر Captain Jozeph Taylor

کپتان جوزف ٹیلر اردو کے پروفیسر تھے۔ انہوں نے بھی ایک مبسوط اردو انگریزی لغت لکھی ہے۔ ڈاکٹر ولیم ہنٹر (Dr. William Hunter) ان کے شریک کار تھے۔ بعد میں ولیم اسمتھ نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کا مختصر اڈیشن شائع کیا۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. فورٹ ولیم کالج کے قیام کے اغراض و مقاصد بیان کیجیے۔
2. جان گل کرسٹ کی اردو خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. جان کرسٹ کے بعد اردو کے کون کون سے انگریز پروفیسران ہوئے؟

15.5 میر امن دہلوی

میر امن دہلوی کو جتنی شہرت اور جیسی مقبولیت حاصل ہوئی ویسی فورٹ ولیم کالج کے کسی بھی مصنف کے حصے میں نہیں آئی۔ میر امن تخلص تھا، نام میر امان تھا۔ ہمایوں کے عہد میں ان کے آباو اجداد ہندوستان آئے۔ مغلیہ دربار سے وابستہ رہے۔ یہ سلسلہ عالم گیر ثانی تک قائم رہا۔ میر امن کا آبائی وطن دہلی ہی تھا۔ نادر شاہ درانی کے حملے سے دہلی تباہ ہوگئی۔ اور وہاں کے لوگ دلی چھوڑ کر دوسری جگہ جانے لگے۔ میر امن اس کے باوجود دلی

Scanned with CamScanner

میں رہے۔ لیکن جب روزگار کے لالے پڑ گئے تو پھر پٹنہ اور اس کے بعد کلکتہ پہنچے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فورٹ ولیم کالج کو لائق آدمیوں اور منشیوں کی ضرورت تھی۔ منشی بہادر علی حسینی ان کے دوست تھے۔ وہ پہلے سے فورٹ ولیم کالج میں خدمت انجام دے رہے تھے۔ انہیں کی توسط سے وہ کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہ کالج میں کب تک کام کرتے رہے اس بات کا علم نہیں ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ 1801ء میں کالج میں ملازم ہو گئے تھے۔ انہوں نے 1802ء اپنی دونوں کتابیں مکمل کر لی تھیں۔ اس کے بعد وہ کالج میں کیا خدمت انجام دیتے رہے اور انہوں نے کون سے کام انجام دیے اس کے تعلق سے کوئی تحقیقی مواد نہیں ملتا۔ ان کی پیدائش کی تاریخ اور وفات کی تاریخ کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ اردو کے اتنے اہم ادیب کے بارے میں ہماری معلومات محدود ہیں۔

میر امن نے قصہ چہار درویش کو ''باغ و بہار'' کے نام سے لکھ کر شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں اپنی جگہ بنالی ہے۔ ''باغ و بہار'' اس کا تاریخی نام ہے یعنی اگر اس کے حروف کے اعداد کو جوڑ لیا جائے تو اس کا سنہ تصنیف نکل آتا ہے۔ قصہ چہار درویش فارسی کا ایک مشہور قصہ ہے۔ اس قصہ کا اصلی مصنف کون تھا اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ یہ قصہ امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیا کو اس وقت سنایا جب وہ بیمار تھے۔ میر امن نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ لیکن بعد کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ بیرونی اور اندرونی شہادتوں سے یہ بات پائے ثبوت کو پہنچتی ہے کہ امیر خسرو کے بعد کے زمانے میں یہ قصہ لکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر قصہ چہار درویش میں تمباکو اور بارود کا ذکر ہے جب کہ یہ دونوں چیزیں ہندوستان میں امیر خسرو کے ایک سو سال بعد استعمال ہوئیں۔ بہر حال یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔

اُردو میں میر امن سے پہلے میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے قصہ چہار درویش کو ''نوطرز مرصع'' کے نام سے لکھا تھا۔ تحسین کا یہ قصہ بہت ادق زبان میں ہے اور اس کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے۔ قصہ چہار درویش کو میر محمد علی خاں شوق اور رنگ آبادی نے اردو میں نظم کیا ہے۔ اس کی زبان دکنی ہے۔ عوض زرین نے بھی قصہ چہار درویش کو مختصر کر کے ''نوطرز مرصع'' کے نام سے لکھا ہے۔ اس طرح قصہ چہار درویش کو بہت سے لوگوں نے لکھا لیکن ان سے کوئی واقف بھی نہیں ہے لیکن ''باغ و بہار'' اب بھی شوق و ذوق سے پڑھی جاتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا اور اہم سبب یہ ہے کہ اس کا اسلوب اس قدر پر کشش اور خوب صورت ہے کہ قصہ چہار درویش کو جتنی اور جیسی مقبولیت اور شہرت اس کتاب سے حاصل ہوئی وہ کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہو سکی۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' نے نہ صرف اردو میں شہرت پائی بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ ایل۔ ایف۔ اسمتھ نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا وہ بھی اتنا مقبول ہوا کہ اس کے کئی اڈیشن مدراس، کلکتہ، لندن اور لکھنؤ سے شائع ہوئے۔ پھر ڈنکن فاربس نے 1857ء میں انگریزی میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔ گارساں وتاسی نے فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا۔ غلام محمد خاں خیبر نے ''خریطۂ سرور'' کے نام سے اسے منظوم کیا۔ سید محمد نے اپنی کتاب ''ارباب نثر'' اردو میں اس کے ترجموں کی تفصیل دینے کے بعد بجا طور پر لکھا ہے:

> ''میر امن کے ترجمے کے سوا آج کسی کے ترجمے کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ میر امن نے اپنے ترجمے میں ایسی سحر کاری کی ہے کہ وہی اب تک مقبول ہے اور جب تک اردو زبان زندہ ہے مقبول رہے گا۔ اس کی قدر و قیمت میں سرور ایام کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائے گا''۔ (ارباب نثر اردو۔ ۴۳)

''باغ و بہار'' لکھنے کے بعد ''گنج خوبی'' کے نام سے میر امن نے ملا حسینی کاشفی کی مشہور کتاب ''اخلاق محسنی'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ جیسا کہ فارسی کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں اخلاقی حکایتوں کو پیش کر کے نصیحت آموز نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ لیکن یہ کتاب غیر معروف رہی۔

15.6 سید حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس

میر امن دہلوی کے بعد فورٹ ولیم کالج کے جن مصنفین کو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سید حیدر بخش حیدری اور شیر علی افسوس کے نام آتے ہیں۔ یہ کئی کتابوں کے مترجم تھے۔ حیدری بھی دہلی ہی کے باشندے تھے۔ حیدری کے والد نے ان کی تعلیم و تربیت کا بہت اچھا انتظام

Scanned with CamScanner

اکائی 23 : علی گڑھ تحریک

ساخت

23.1 تمہید
23.2 پس منظر
23.3 1857ء کے واقعات، سرسید اور ان کی تحریک
23.4 سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق
23.5 اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات
23.6 خلاصہ
23.7 نمونۂ امتحانی سوالات
23.8 فرہنگ
23.9 سفارش کردہ کتابیں

23.1 تمہید

اس اکائی میں علی گڑھ تحریک کا تعارف کروایا گیا ہے۔ یہ تحریک اردو ادب کی ایک مقبول اور فعال تحریک تھی اور اردو کی دیگر ادبی تحریکوں کے مقابلے میں اس کے بڑے دیرپا نتائج برآمد ہوئے۔ چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا۔ اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے مشہور ہوئی اور سرسید احمد خان اس کے سب سے بڑے علم بردار اور محرک تھے اس لیے اسے سرسید تحریک کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

1857ء کی جنگِ آزادی اس تحریک کا نقطہ آغاز ہے۔ یہی وہ سال ہے جب کہ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے بجرمانہ عہد اقتدار کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جو ناکام رہی اور اسی سال سلطنت مغلیہ کا اختتام ہوا۔ علی گڑھ تحریک کا دوسرا اہم اور مثبت پہلو یہ ہے کہ انگریزوں کے دور اقتدار میں ہندوستان میں کئی سماجی، معاشرتی اور ادبی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

سرسید احمد اپنے عہد کے ایک صاحب بصیرت مصلح تھے۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ 1857ء کے ہنگاموں کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں پر بہت زیادہ ظلم و زیادتی کی۔ چنانچہ مسلمانوں کو انگریزوں کے عتاب سے بچانے اور ان کے ذہن کو صاف کرنے کے لیے ''سرکشی بجنور'' اور ''اسباب بغاوت ہند'' جیسی کتابیں تصنیف کر کے یہ ثابت کیا کہ 1857ء کی بغاوت کے ذمے دار صرف مسلمان اور ہندوستانی نہیں بلکہ یہ بغاوت انگریزوں کی کوتاہیوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے مقالات اور مضامین کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمان انگریزوں کے بدخواہ نہیں۔

سرسید کی نظر مسلمانوں میں پائی جانے والی کمزوریوں اور برائیوں پر بھی تھی۔ وہ اپنی قوم کو جہالت کی پستی اور تنگ نظری کے اندھیرے سے نکال کر اعلیٰ تعلیم کے اجالے میں لانا چاہتے تھے ان میں بلند خیالی اور وسعت نظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلے کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی علوم فنون سے اپنی قوم کو بہرہ مند کرنا چاہتے تھے۔

مغربی علوم و فنون اور انگریزی ادبیات سے اثر پذیری کے نتیجے میں نہ صرف اردو شعر و ادب میں تبدیلیاں آئیں بلکہ متعدد نئی اصناف بھی وجود میں آئیں۔

Scanned with CamScanner

23.2 پس منظر

سکوت و جمود کی یک رنگی کو توڑ کر اس میں تحرک و تبدل کی رنگارنگی اور تنوع پیدا کرنے کے عمل کو تحریک کہتے ہیں۔ ادب میں جب کبھی یکسانیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں یا سکوت و انجماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو ادبی تحریک اس میں تحرک و تغیر پیدا کرتی ہے اور اس کی کہنگی کو زائل کر کے تازگی تنوع اور نیرنگی پیدا کرتی ہے۔ علی گڑھ تحریک اردو کی ادبی تحریکوں میں سب سے فعال اور توانا تحریک ہے جس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اس تحریک کا نقطۂ آغاز دراصل 1857ء کی جدوجہد آزادی ہے۔

1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، سماجی اور ادبی نقطۂ نظر سے ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اسی سال ہندوستانیوں نے انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد کی جو ناکام رہی۔ اور اسی سال ہندوستان پر غیر ملکی حکومت مسلط ہوگئی۔ ایک تہذیب نے دم توڑ دیا تو دوسری تہذیب نے نئی زندگی پائی۔ انگریزوں کے تسلط کے زیر اثر ملک میں کئی سماجی معاشرتی اور ادبی انقلابات رونما ہوئے۔ سرسید احمد خان اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار اور محرک اول تھے۔ اگر 1857ء کا انقلاب نہ ہوتا تو شاید سرسید کی زندگی کا دھارا کسی اور سمت میں بہنے لگتا اور وہ اپنے رفاہی کاموں اور تصنیفی سرگرمیوں میں منہمک رہتے۔

انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں سترھویں صدی سے وارد ہونے لگے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام تک وہ ملک کے کچھ حصوں کے حکمراں بن گئے۔ اور انیسویں صدی کے ربع دوم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ان کا اقتدار ملک کے ایک بڑے حصہ پر ہو گیا تھا۔ بہ قول پروفیسر احتشام حسین:

> ''سچ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی لٹیروں کی ایک تنظیم تھی جس نے اپنے ایک صدی کے مجرمانہ عہد اقتدار میں ملک کو اچھی طرح لوٹا۔ اگر بالواسطہ اس سے کچھ فائدہ بھی پہنچ گیا اور کسی طرح کے نئے شعور کا ظہور بھی ہوا تو اس کے تاریخی اسباب تھے۔ جن سے روگردان نہیں ہوا جا سکتا تھا۔'' [اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ صفحہ 179]

انگریزوں کے لیے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ اسی پالیسی کے تحت انہوں نے ہندوستان کے مختلف طبقوں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حب الوطنی، بھائی چارگی اور قوم پرستی کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی موثر کوشش کی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف طبقے آپس میں برسر پیکار رہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کو گہن لگنے کے بعد وہ روز بہ روز زوال ہونے لگی۔ ملک کے مختلف صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار ہونے لگے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں انگریزوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور سرزمین ہند پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔

1857ء کی جدوجہد آزادی کے زوال کے کئی اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ ہندوستانیوں میں نہ تو کوئی تنظیم اور باقاعدگی تھی اور نہ ہی اس بغاوت کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطۂ نظر سے انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں عشر عشیر بھی طاقت نہیں تھی۔ اس طرح ہندوستان کی پہلی جدوجہد آزادی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگرچہ کہ ہندوستان کے سارے طبقات نے مل کر اس بغاوت میں حصہ لیا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے انگریزوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس لیے یہی طبقہ خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کا معتوب بنا۔ انگریزوں کو یہ احساس بھی تھا کہ انہوں نے حکومت بہر حال مسلمانوں سے چھین لی ہے اور اس طبقہ کو پوری طرح کچل کر وہ ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ ان کی جاگیریں، مناصب اور وظائف بند کر دیے۔ بے شمار لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ متعدد افراد کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ لاتعداد اشخاص تختۂ دار پر چڑھا دیئے گئے اور لاکھوں گھر اجاڑے گئے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

> ''کوئی آفت ایسی نہیں تھی جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسمان

23.2 پس منظر

سکوت و جمود کی یک رنگی کو توڑ کر اس میں تحرک و تبدل کی رنگا رنگی اور تنوع پیدا کرنے کے عمل کو تحریک کہتے ہیں۔ ادب میں جب کبھی یکسانیت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں یا سکوت و انجماد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو ادبی تحریک اس میں تحرک و تغیر پیدا کرتی ہے اور اس کی کہنگی کو زائل کر کے تازگی، تنوع اور نیرنگی پیدا کرتی ہے۔ علی گڑھ تحریک اردو کی ادبی تحریکوں میں سب سے فعال اور توانا تحریک ہے جس کے بڑے دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ اس تحریک کا نقطۂ آغاز دراصل 1857ء کی جدوجہد آزادی ہے۔

1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی، سماجی اور ادبی نقطۂ نظر سے ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہوا۔ اسی سال ہندوستانیوں نے انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایک عظیم الشان جدوجہد کی جو ناکام رہی۔ اور اسی سال ہندوستان پر غیر ملکی حکومت مسلط ہوگئی۔ ایک تہذیب نے دم توڑ دیا تو دوسری تہذیب نے نئی زندگی پائی۔ انگریزوں کے تسلط کے زیر اثر ملک میں کئی سماجی معاشرتی اور ادبی انقلابات رونما ہوئے۔ سرسید احمد خان اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار اور محرک اول تھے۔ اگر 1857ء کا انقلاب نہ ہوتا تو شاید سرسید کی زندگی کا دھارا کسی اور سمت میں بہنے لگتا اور وہ اپنے رفاہی کاموں اور تصنیفی سرگرمیوں میں منہمک رہتے۔

انگریز تجارت کی غرض سے ہندوستان میں سترھویں صدی سے وارد ہونے لگے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی کے اختتام تک وہ ملک کے کچھ حصوں کے حکمراں بن گئے۔ اور انیسویں صدی کے ربع دوم میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں ان کا اقتدار ملک کے ایک بڑے حصہ پر ہو گیا تھا۔ بہ قول پروفیسر احتشام حسین:

> ''سچ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی لٹیروں کی ایک تنظیم تھی جس نے اپنے ایک صدی کے مجرمانہ عہد اقتدار میں ملک کو اچھی طرح لوٹا۔ اگر بالواسطہ اس سے کچھ فائدہ بھی پہنچ گیا اور کسی طرح کے نئے شعور کا ظہور بھی ہوا تو اس کے تاریخی اسباب تھے۔ جن سے روگردان نہیں ہوا جا سکتا تھا۔'' [اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ صفحہ 179]

انگریزوں کے لیے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی حکمت عملی بے حد کارگر ثابت ہوئی۔ اسی پالیسی کے تحت انہوں نے ہندوستان کے مختلف طبقوں خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان حب الوطنی، بھائی چارگی اور قوم پرستی کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی موثر کوشش کی۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف طبقے آپس میں برسرپیکار رہنے لگے۔ مغلیہ سلطنت کو گہن لگنے کے بعد وہ روز بہ روز زوال ہونے لگی۔ ملک کے مختلف صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار ہونے لگے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں انگریزوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور سرزمین ہند پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔

1857ء کی جدوجہد آزادی کے زوال کے کئی اسباب تھے۔ اول تو یہ کہ ہندوستانیوں میں نہ تو کوئی تنظیم اور باقاعدگی تھی اور نہ ہی اس بغاوت کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ ہی تھا۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطۂ نظر سے انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانیوں میں عشر عشیر بھی طاقت نہیں تھی۔ اس طرح ہندوستان کی پہلی جدوجہد آزادی کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اگرچہ کہ ہندوستان کے سارے طبقات نے مل کر اس بغاوت میں حصہ لیا تھا لیکن بہ حیثیت مجموعی مسلمانوں نے انگریزوں کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا تھا۔ اس لیے یہی طبقہ خصوصیت کے ساتھ انگریزوں کا معتوب بنا۔ انگریزوں کو یہ احساس بھی تھا کہ انہوں نے حکومت بہر حال مسلمانوں سے چھین لی ہے اور اس طبقہ کو پوری طرح کچل کر وہ ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما سکتے ہیں۔ چنانچہ انگریزوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ ان کی جاگیریں، مناصب اور وظائف بند کر دیے۔ بے شمار لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ متعدد افراد کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ لاتعداد اشخاص تختۂ دار پر چڑھا دیئے گئے اور لاکھوں گھر اجاڑے گئے۔ سر سید احمد خان لکھتے ہیں:

> ''کوئی آفت ایسی نہیں تھی جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی، کوئی بلا آسمان

سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں ان میں بھی یہی کہا گیا کہ ہندوستان میں مفید اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں لگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جس کے بارے میں یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔'' [بحوالہ ''ادیب'' زبان وادب کی تاریخ نمبر 1993 ص 220]

اپنی معلومات کی جانچ :

1. تحریک کسے کہتے ہیں؟
2. کن وجوہات کی بنا پر 1857ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں ایک انقلابی موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔
3. پہلی جدوجہد آزادی کی ناکامی کے اسباب بیان کیجیے۔

23.3 1857ء کے واقعات اور علی گڑھ تحریک

1857ء کے واقعات نے سرسید کو بے حد متاثر کیا۔ اس زمانے میں عام طور پر ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں کو جس تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا اس کی تفصیلات سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑنے والی اس قیامت صغریٰ کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ بے گناہوں کو تباہ و برباد ہوتے دیکھ کر ان کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ ترک وطن پر آمادہ تھے لیکن قوم کے درد نے انہیں اپنے ہم وطنوں کو مصیبت میں چھوڑ کر گوشہ عافیت میں پناہ لینے سے روک دیا۔ سرسید اپنی قوم کا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے لیے تادم آخر کوشاں رہے۔ مسلمانوں کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے انہوں نے متعدد مضامین لکھے۔ حکمرانوں سے دوستی کی پیش کش کی لیکن اس کے صلے میں انہیں کافر کا فتویٰ دیا گیا اور غدار کہا گیا۔ اس کے باوجود سرسید نے ہمت نہیں ہاری اور بڑی پامردی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اپنی قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے مسلسل کوشاں رہے اور بالآخران کی یہ سعی و کاوش مخالفتوں کے باوجود کارگر ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر نورالحسن نقوی لکھتے ہیں:

> ''وہ قوم جس کے جان بر ہونے کے آثار نظر نہ آتے تھے' سرسید کی کوشش سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ترقی کے راستے پر گامزن ہوئی۔ سرسید کی یہ کوشش سرسید تحریک کہلائی اور چونکہ اس کا مرکز علی گڑھ تھا اس لیے علی گڑھ تحریک کے نام سے یاد کی گئی'' [بحوالہ: ''ادیب'' زبان وادب کی تاریخ نمبر۔ صفحہ 222]

علی گڑھ تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد مسلمانوں میں پائے جانے والے عیوب و نقائص کو دور کر کے انہیں فلاح و بہبود کے راستے پر گامزن کرنا تھا۔ سرسید اس تحریک کے روح رواں تھے۔ وہ مسلمانوں کو عہد جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنی قوم کو فرسودہ روایات اور توہم پرستی کے رجحان سے کنارہ کش ہونے' زندگی کے مادی مسائل سے دلچسپی لینے اور تجدد و تحرک کے میدان کو اپنانے کا درس دیا۔ سرسید کا دور مسلمانوں کی پستی اور انتشار کا زمانہ تھا۔ اس دور کے مسلمانوں میں دنیا بھر کی برائیاں اور خرابیاں موجود تھیں۔ ان میں ایک طرف جہالت' بے علمی اور بے حسی تھی تو دوسری طرف سستی' کاہلی' چاپلوسی' خوشامد' تعصب اور ریاکاری جیسے عیوب بھی موجود تھے۔ یہاں تک کہ وہ کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور شرفا کی طرز گفتگو سے بھی بے بہرہ تھے۔ سرسید کی ان سارے مسائل پر نظر تھی۔ اس لیے انہوں نے مسلمانوں میں جدوجہد کی نئی روح پھونکنے کا فقید المثال کارنامہ انجام دیا۔

سرسید نے انگریزوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ انگریز عہدہ داروں کیساتھ انہوں نے چھوٹی بڑی متعدد خدمات پر کام کیا تھا۔ 1857ء کے ہنگامے میں انسانی ہمدردی کے جذبے سے انہوں نے بعض انگریز عہدہ داروں اور ان کے اہل خانہ کی جانیں بچائی تھیں۔ انگریزوں کی تہذیب و تمدن' اخلاق و

Scanned with CamScanner

معاشرت اور علوم وفنون میں جو باتیں قابل تعریف تھیں سرسید انہیں بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ 1857ء کے واقعات کے بعد ہندوستانی دانشوروں نے محسوس کیا کہ انگریز جیسی طاقتور اور منظم قوم کا مقابلہ ہندوستانیوں کے لیے سردست ممکن نہیں۔ اول تو اس لیے کہ ہماری قوم نہایت پسماندہ اور حد درجہ غیر منظم ہے۔ دوسرے یہ کہ مادی نقطہ نظر سے انگریزوں سے مقابلے کی طاقت بھی ہندوستانیوں میں نہیں تھی۔ اس لیے مصلحانِ قوم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ موجودہ مرحلے میں ہندوستانیوں کا انگریزوں سے مقابلہ کرنا دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ عملاً ہندوستانی اور انگریز ایک قابل عمل سمجھوتہ پر پہنچ جائیں اور ہندوستانی قوم انگریزوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مغربی علوم وفنون سے استفادہ کرے اور اس طرح پہلے ذہنی طور پر انگریزوں سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو پوری طرح تیار کر لے۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور مسلمانوں میں سرسید اور ان کے رفقا نے یہ ذمہ داری قبول کی۔ اس کے بعد سرسید کی ساری زندگی اس کام کے لیے وقف ہوگئی کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا سمجھوتہ ہو جائے کہ مسلمان اس ملک میں عزت کے ساتھ زندگی گزار سکیں اور ملک کے کاروبار میں اپنا موثر کردار ادا کر سکیں۔

سرسید نے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں کو مغربی زبان وادب اور علوم وفنون سے فیض یاب کرنے کے لیے 1869ء میں انگلستان کا سفر بھی کیا تھا اور اس سفر کا مقصد ایک طرف مسلمانوں کے لیے ایک ایسا تعلیمی منصوبہ پیش کرنا تھا جس کے سہارے مسلمانوں کی نئی نسل متمدن دنیا میں اپنا موثر حصہ ادا کر سکے اور دوسری طرف ایک ایسے تعلیمی ادارے کے خواب کو عملی جامہ پہنانا تھا جس میں مسلمان نوجوانوں کو مغربی علوم وفنون کی بھی تعلیم دی جائے اور اس کے پہلو بہ پہلو مشرقی تہذیب یا اسلامی تمدن کی بنیادی خوبیاں بھی ان کی سیرت میں برقرار رہیں۔ انگلستان میں کم وبیش ڈیڑھ سال قیام کرنے کے بعد 1870ء میں سرسید جب ہندوستان واپس آئے تو 4 مئی 1875ء کو انہوں نے اپنے دیرینہ خواب کو "مدرسۃ العلوم مسلمانان" (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج) کی صورت میں عملی جامہ پہنایا۔ پہلے یہ ادارہ صرف اسکول کی جماعتوں تک محدود تھا۔ اور پھر بعد کو یہاں کالج کی سطح پر بھی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں:۔

"سرسید اس مدرسہ سے چار طرح کے تعلیم یافتہ پیدا کرنا چاہتے تھے:

1. وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے سرکاری اعلیٰ عہدے اور عزتیں پائیں۔
2. وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم پا کر مغربی علوم کو اردو میں منتقل کریں۔
3. وہ جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم پا کر ایسی لیاقت حاصل کر لیں جس کا معیار انگلستان کے کالجوں کے برابر ہو۔
4. وہ جو عربی اور فارسی میں کمال حاصل کر کے مسلمانوں کے قدیم سرمایے کو موجودہ نسلوں تک پہنچائیں۔"

[اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ صفحہ 229]

اپنی معلومات کی جانچ:

1. سرسید پر 1857ء کے واقعات کا کیا اثر ہوا؟
2. علی گڑھ تحریک کو اصلاحی تحریک کیوں کہا جاتا ہے؟
3. سرسید نے انگلستان کا سفر کیوں کیا تھا؟

23.4 سائنٹفک سوسائٹی اور تہذیب الاخلاق

سرسید نے اپنے علمی و اصلاحی مقاصد کے حصول کے لیے غازی پور میں ایک انجمن قائم کی تھی جس کا نام سائنٹفک سوسائٹی (Scientific Society) تھا۔ یہ سوسائٹی سائنٹفک انداز میں سیاسی، سماجی اور تمدنی مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ جب ان کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا تو انہوں نے سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ منتقل کر دیا۔ اس سوسائٹی کی طرف سے "اخبار سائنٹفک سوسائٹی" جاری کیا گیا جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے "علی

Scanned with CamScanner

(انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' رکھا گیا۔ اس اخبار میں ایک کالم اردو میں ہوتا اور ایک انگریزی میں تاکہ مسلمان اور انگریز بیک وقت ان مسائل سے آگاہ ہوں جو ان کے پیش نظر تھے۔ اس رسالے کے ذریعہ سر سید نے مسلمانوں کی آواز کو حکمران طبقے تک پہنچانے کی کامیاب کوشش کی تھی اور پھر اپنے اصلاحی خیالات کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں 1870ء میں اپنا مشہور رسالہ ''تہذیب اخلاق'' جاری کیا۔ اس رسالے کا مقصد 1857ء کی تباہ حال قوم کو سماجی، اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے دوبارہ زندگی بخشنا تھا۔ سر سید اور ان کے رفقا اس رسالے میں روزمرہ کے اہم مسائل پر بڑے سلجھے ہوئے اور عالمانہ مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس رسالے نے 1857ء کی بغاوت کے بعد مسلمانوں کی باز آبادکاری میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی، مسٹر آرنلڈ، محسن الملک، وقار الملک، اعظم جنگ، چراغ علی، ذکا اللہ، دینا ناتھ گنگولی، کاشی ناتھ، سمیع اللہ خان، حاجی محمد اسماعیل، منشی پیارے لال، وحید الدین سلیم وغیرہ ''تہذیب الاخلاق'' میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

''تہذیب الاخلاق'' کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اردو میں مضمون نگاری کے فروغ میں ایک نمایاں کردار ادا کیا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والے سبھی مضامین معیاری ہوتے تھے۔ ان مضامین نے نہ صرف لوگوں کی ذہنیت کی تربیت کی بلکہ ان میں روشن خیالی پیدا کی اور ان کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز کو بھی بدل دیا۔ ''تہذیب الاخلاق'' نے اردو شعر وادب کی قدیم وجدید تمام اصناف پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

> ''مرحوم سر سید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں ایک کالج ہی نہیں قائم کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی وادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ تہذیب الاخلاق سے مرتب ہوئے۔ فی الحقیقت جدید علم وادب کی بنیادیں اسی رسالے نے استوار کیں اور اس کو اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی اور ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابل ذکر اہل قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقہ کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اس حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق وتصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔ اردو کی نئی شاعری کی بنیاد اگرچہ لاہور میں پڑی تھی مگر اس کو نشو ونما یہیں کی آب وہوا سے ملی ...... اردو خطابت کی پہلی درسگاہ یہی تھی اس دور کے تمام مشہور مقرروں کو اسی حلقے نے پیدا کیا اور اگر پیدا نہیں کیا تھا تو ان کے لیے پلیٹ فارم یہیں مہیا کیا گیا۔''
>
> [کانوکیشن ایڈریس۔ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔ 20 فروری 1949]

اپنی معلومات کی جانچ :

1. سائنٹفک سوسائٹی کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟
2. مضمون نگاری کے فروغ میں رسالہ تہذیب الاخلاق کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔
3. تہذیب الاخلاق کے چند معروف لکھنے والوں کے نام بتائیے۔

23.5 اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات

علی گڑھ تحریک کی مختلف النوع خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس تحریک نے اردو شعر وادب پر بڑے گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے۔ خصوصاً اردو ادب کو مغربی علوم وفنون سے فیض یاب کرنے میں علی گڑھ تحریک نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ سر سید احمد خان اور

ان کے نامور رفقاء الطاف حسین حالی، نذیر احمد، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، وقار الملک، محسن الملک اور چراغ علی اس تحریک کے ممتاز اراکین تھے۔ بعد کو اس عظیم الشان تحریک سے وابستہ ہونے والے شعراء اور ادیبوں میں وحید الدین سلیم، نواب عماد الملک، عبدالحلیم شرر، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر ضیاء الدین، آفتاب احمد خان، مولوی عبدالحق، طفیل احمد، ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، عزیز مرزا، عنایت اللہ، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر عابد حسین، غلام السیدین، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب قابل ذکر ہیں:

جہاں تک اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات کا تعلق ہے، فورٹ ولیم کالج کی کوششوں اور مکاتیب غالب کی مقبولیت کے باوجود اردو نثر ابھی تک فارسی زبان و ادب کے رجحانات سے بے حد متاثر تھی۔ عام بول چال کی سیدھی سادی زبان تحریر میں استعمال نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی زبان کے زیر اثر سرسید اور ان کے رفقاء نے عام بول چال کی زبان کو تحریر میں استعمال کرنے کی کامیاب تحریک چلائی۔ اس تحریک کا مقصد عبارت آرائی سے گریز کرتے ہوئے اپنے مشاہدات، تجربات اور خیالات کو سیدھے سادے اور عام فہم لیکن موثر انداز میں پیش کرنا تھا۔ دوسرے الفاظ میں خیال کو بنیادی اہمیت دی گئی اور زبان و بیان کی خوبیوں کو ثانوی۔ سرسید کے نزدیک تخلیق ادب بیکاری کا مشغلہ نہیں بلکہ یہ زندگی اور سماج کو سنوارنے، سدھارنے اور بہتر بنانے کا سب سے اچھا ذریعہ ہے۔ ان کے خیال میں ادب میں زندگی کے مسائل کی اس طرح ترجمانی ہونی چاہیے کہ اس سے زندگی اور معاشرے کو فائدہ پہنچے۔ اس طرح وہ ادب کے افادی پہلو کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں۔ سرسید بنیادی طور پر ایک سماجی مصلح تھے۔ اس مقصد کی تبلیغ و تلقین کے لیے فطری طور پر انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اردو زبان کا استعمال کیا اور اس طرح اردو زبان بالواسطہ طریقے پر سرسید کی عظیم الشان سماجی تحریک سے وابستہ ہوگئی۔ چونکہ سرسید کا اسلوب پر اثر تھا اس لیے نہ صرف ان کے ہم نوا بلکہ مخالفین بھی جوان کی مخالفت میں اخبار اور رسالے نکالتے تھے، نادانستہ طور پر سرسید کی زبان اور ان کے اسلوب کی پیروی کرتے تھے۔ اس طرح سماجی انقلاب کی اس جدوجہد میں اردو نثر کا سادہ اور موثر اسلوب خود بہ خود اردو لکھنے والوں میں رواج پا گیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بالکل درست لکھا ہے:

> ''سرسید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اردو کو جو علمی اعتبار سے اس وقت تک ایک بے مایہ زبان تھی، تھوڑے عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر ریزوں سے مالا مال کر دیا۔'' [سرسید اور ان کے نامور رفقا۔ صفحہ 58]

علی گڑھ تحریک کی سعی و کوشش سے انگریزی زبان و ادب کے زیر اثر متعدد اصناف ادب جیسے ناول، مختصر افسانہ، تنقید، انشائیہ، سوانح عمری وغیرہ اردو میں رائج ہوئے۔ سرسید نے انگریزی کے مشہور ادیبوں جوزف ایڈیسن (Joseph Eddison) اور رچرڈ اسٹیل (Richard Steele) کی تقلید میں اپنے رسالے تہذیب الاخلاق میں مختلف سماجی، اخلاقی، علمی، دینی اور سیاسی مسائل پر خود بھی مضامین لکھے اور اپنے رفقاء سے بھی لکھوائے۔ اس طرح مختصر مضمون (Essay) اور انشائیے (Light Essay) کی صنف اردو میں رواج پانے لگی۔ ان مضامین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان میں ایک طرف سائنٹفک انداز اور عقلیت پسندی پر زور دیا جاتا تو دوسری طرف غیر ضروری لفاظی اور عبارت آرائی سے گریز کیا جاتا تھا۔ اسلوب بیان کی سادگی اور تاثر کی فراوانی اس تحریک کی بنیادی خصوصیت تھی۔ غرض علی گڑھ تحریک ایک عظیم الشان اصلاحی، علمی اور ادبی تحریک تھی جس کے بڑے دور رس اور دیرپا نتائج سامنے آئے۔ بہ قول پروفیسر نورالحسن نقوی:

> ''ہماری زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے احساں سے گراں بار نہ ہو۔ اس تحریک نے بے عملوں کو جدوجہد عمل کا درس دیا۔ ماضی کے پرستاروں کو حال کی اہمیت سے آشنا کیا۔ تنگ نظروں کو وسعت نظر سکھائی۔ بزرگوں کے کارناموں پر فخر کرنے والوں کو اپنی ذات میں خوبیاں پیدا کرنے پر آمادہ کیا۔ مشرق کے پجاریوں کو مغرب کے کارناموں سے آشنا کیا۔ دنیا کو بے حقیقت بتانے والوں کو دنیا میں نیکی کمانے اور آخرت کے لیے توشہ جمع کرنے کا راستہ دکھایا۔ اس عظیم الشان تحریک نے سوتوں کو جگایا اور مردوں میں جان ڈالی۔ مختصر یہ کہ علی گڑھ تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کو زندہ قوموں کی طرح زندگی گزارنے اور سربلند ہو کر جینے کا سلیقہ سکھایا۔''

[پروفیسر نورالحسن نقوی۔ ادیب (سہ ماہی) 1993ء ص 231]

Scanned with CamScanner

علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس 1936ء کے اوائل میں خواجہ منظور حسین کے مکان پر ہوا۔ سردار جعفری' جان نثار اختر' حیات اللہ انصاری' اسرار الحق مجاز' اختر حسین رائے پوری' خواجہ احمد عباس' شاہد لطیف اور سبط حسن وغیرہ اشتراکیت میں دلچسپی رکھتے تھے۔ سبط حسن ان دنوں حیدر آباد میں قاضی عبدالغفار کے اخبار "پیام" میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے حیدر آباد میں اس کو منظم کیا۔ ہرین مکرجی نے کلکتہ میں انجمن کی تشکیل کی۔ پنجاب میں محمود الظفر' رشید جہاں' فیض احمد فیض نے انجمن بنائی۔ پنجاب میں میاں افتخار الدین و فیروز الدین منصور نے بھی اس تحریک کے فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔ بہار میں سہیل عظیم آبادی اور اختر اورینوی نے ایک حلقہ قائم کرلیا۔ اس طرح یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. لندن میں ہندوستانی نوجوانوں نے اپنی انجمن کا نام کیا رکھا؟

(ا) انڈین رائٹرز ایسوسی ایشن (ب) پروگریسو ایسوسی ایشن (ج) انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن (د) پروگریسو انڈین ایسوسی ایشن

2. افسانوں کا مجموعہ "انگارے" کس سنہ میں شائع ہوا

(ا) 1932ء (ب) 1935ء (ج) 1936ء (د) 1938ء

3. علی گڑھ میں ترقی پسند مصنفین کا پہلا اجلاس کس کے مکان پر ہوا۔

(ا) سردار جعفری (ب) حیات اللہ انصاری (ج) شاہد لطیف (د) خواجہ منظور حسین

27.3 آغاز

ترقی پسند تحریک پہلی ادبی تحریک تھی جس میں مختلف زبانوں کے ادیب نظریاتی اتحاد کی وجہ سے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو رہے تھے۔ اس بات کو محسوس کیا جانے لگا کہ ایک کانفرنس بلائی جائے جس میں دنک کے ادیب جمع ہو کر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کریں اور انجمن کا ایک لائحہ عمل تیار کریں۔ انجمن کا دستور مرتب کریں۔ پوری دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے پیدا کردہ سیاسی بحران سے تہذیب و کلچر کو جو خطرات درپیش ہیں ان کے تدارک کے لیے تمام ادیب متحد ہو کر ایسی سیاسی قوتوں کا ساتھ دیں جو ترقی پسند خیالات رکھتی ہوں۔ ترقی پسند ادیبوں نے پہلی کانفرنس اپریل 1936ء میں لکھنو میں بلائی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر صاحب طرز ادیب چودھری محمد علی رودلوی منتخب کیے گئے۔ اس کانفرنس میں پریم چند' مولانا حسرت موہانی' جئے پرکاش نرائن' کملا دیوی چٹوپادھیائے' میاں افتخار الدین' یوسف علی مہر' اندولال یاجنک وغیرہ نے شرکت کی۔ بنگال' گجرات' مہاراشٹرا اور مدراس کے ادیب شریک ہوئے اور اپنی زبان و ادب کے مسائل پر تقریریں کیں۔ اس کانفرنس کو دو چیزوں کی وجہ سے اہمیت حاصل ہے۔ ایک اعلان نامہ دوسرا پریم چند کا خطبہ صدارت!

اعلان نامہ میں کہا گیا کہ ہندوستانی مصنفین کا یہ فرض ہے کہ ملک میں جو ترقی پذیر رجحانات ابھر رہے ہیں ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں حصہ لیں۔ بے بنیاد روحانیت اور تصور پرستی چھوڑ کر عقلیت کو اختیار کریں۔ ادبیات اور دیگر فنونِ لطیفہ کو قدامت پرستوں سے نجات دلا کر عوام کے دکھ سکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنائیں۔ نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل بھوک' افلاس' سماجی پستی اور غلامی کو موضوع بنائے۔ انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے:

1. تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔
2. ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کی کوشش کرنا۔

Scanned with CamScanner

ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

آزادیٔ رائے اور آزادیٔ خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کہا:

''ادب کی بہت سی تعریفیں کی گئی ہیں لیکن میرے خیال میں اس کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے ..... ہمیں حسن کا معیار تبدیل کرنا ہوگا۔ ابھی تک کا معیار امیرانہ اور عیش پرور آنہ تھا۔ ہمارا آرٹسٹ امرا کے دامن سے وابستہ رہنا چاہتا تھا انہیں کی قدردانی پر اس کی ہستی قائم تھی..... ہمارا آرٹ شباہیات کا شیدائی ہے اور نہیں جانتا کہ شباب سینے پر ہاتھ رکھ کر شعر پڑھنے اور صنف نازک کی کج ادائیوں کے شکوے کرنے یا اس کی خود پسندیوں اور چونچلوں پر سر دھننے میں نہیں ہے۔ شباب نام ہے آئیڈیل کا' ہمت کا' مشکل پسندی کا' قربانی کا.....

پریم چند نے اس یادگار جملے پر اپنے خطبے کو ختم کیا:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب کھرا اترے گا جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو جو ہم میں حرکت ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی''

اس کانفرنس میں مولانا حسرت موہانی نے بھی تقریر کی۔ انہوں نے کہا ''محض ترقی پسندی کافی نہیں ہے' جدید ادب کو سوشلزم اور کمیونزم کی بھی تلقین کرنی چاہیے اور انقلابی ہونا چاہیے۔ اسلام اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری نصب العین اس کا متقاضی ہے کہ ساری دنیا میں مسلمان اشتراکی نظام قائم کرنے کی کوشش کریں.....

پرانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ وہ محض دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ شاعری کے معاملے میں آپ کو میری تقلید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں خود اس قسم کے نئے ترقی پسند ادب کی تخلیق میں آپ کی پوری مدد کروں گا۔ (سجاد ظہیر'' روشنائی'' ص ۱۱۲)

اس کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا دستور اساسی پیش کیا گیا جو بالاتفاق منظور ہوا۔ اس دستور کا مسودہ سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم اور محمود الظفر نے مل کر تیار کیا۔ اس کانفرنس میں سجاد ظہیر کو کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سکریٹری چنا گیا۔ لکھنؤ کی کل ہند کانفرنس کے پورے ملک میں چرچے ہونے لگے۔ پریم چند نے اپنے خطبۂ صدارت کا ہندی میں ترجمہ کیا اور رسالہ ہنس جولائی 1936ء میں شائع کیا۔ پریم چند جہاں بھی جاتے اس تحریک کا ضرور تذکرہ کرتے۔ دہلی میں اختر حسین رائے پوری نے انجمن کی شاخ قائم کی۔ ڈاکٹر عابد حسین نے تحریک کی سرپرستی کی۔ شاہد احمد دہلوی نے انجمن کے مقاصد کے لیے ایک علحدہ ماہنامہ ''شاہ جہاں'' جاری کیا۔ کانپور میں انجمن قائم ہوئی اور مولانا حسرت موہانی کو صدر منتخب کیا گیا۔ لکھنؤ اور حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے متاثر ہو کر نوجوان اس کے قریب آنے لگے۔ سجاد ظہیر اور ڈاکٹر اشرف نے لاہور کا سفر کیا اور وہاں علامہ اقبال سے ملاقات کی۔ اس تحریک کے مقاصد پیش کیے۔ علامہ اقبال نے ہمت افزائی کی اور کہا:

''ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند ادب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے' آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیں''

(روشنائی' سجاد ظہیر ص ۱۷۰)

ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادیب بھی انجمنیں قائم کرنے لگے۔ اس طرح یہ تحریک ہندوستان گیر حیثیت اختیار کرنے لگی۔

1937ء میں اردو اور ہندی کے ترقی پسند ادیبوں نے الہ آباد میں ایک کانفرنس کی۔ مجلس صدارت میں آچاریہ نریندر دیو' پنڈت رام نریش ترپاٹھی اور مولوی عبدالحق شامل تھے۔ مولوی عبدالحق اس کانفرنس میں شرکت نہ کر سکے لیکن اپنا خطبۂ صدارت بھیج دیا۔ انہوں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔

Scanned with CamScanner

الہ آباد میں 1938ء میں پھر ایک کانفرنس بلائی گئی۔ مجلس صدارت کے لیے جوش ملیح آبادی' آنند نرائن ملا اور ہندی کے مشہور شاعر سمترانندن پنت کا نام منتخب کیا گیا۔ اس کانفرنس میں پنڈت نہرو نے تقریر کی۔ انہوں نے کہا:

''ادیب کی پہنچ جہاں ہوتی ہے وہاں سیاست داں کی نہیں۔ اس کے پاس عام لوگوں کی زبان ہوتی ہے' اس سے مدد لے کر وہ خیالی دنیا اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک پُل بناتا ہے جس پر ہو کر عام لوگوں کے دماغ خیالی دنیا تک پہنچ جاتے ہیں تو پھر واقعی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں.....

آنے والے انقلاب کے لیے ملک کو تیار کرنا' اس کی ذمہ داری ادیب پر ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کے مسئلوں کو حل کیجیے' ان کو راستہ بتایئے لیکن آپ کی بات آرٹ کے ذریعہ ہونی چاہیے نہ کہ منطق کے ذریعے۔ آپ کی بات ان کے دل میں اتر جانی چاہیے۔ ہندوستان میں ادیبوں نے بڑا اثر کیا ہے مثلاً بنگال میں ٹیگور نے لیکن ابھی تک ایسے ادیب کم پیدا ہوئے جو ملک کو زیادہ آگے لے جاسکیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام ایک بڑی ضرورت کو پورا کرتا ہے اور اس سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

الہ آباد کی اس کانفرنس میں ٹیگور نے جو پیغام بھیجا اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اپنے پیغام کے آخر میں انہوں نے لکھا۔

''یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے 'انا' کی کینچلی اتارو' کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے باہر نکلنے کی منزل طے کرو پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے' روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔'' (نیا ادب جنوری/فروری 1941)

اپنی معلومات کی جانچ

1. پریم چند نے خطبۂ صدارت میں کیا کہا؟

(ا) ادب کی بہترین تعریف تنقید حیات ہے۔ (ب) ادب دل بہلانے کی چیز ہے۔
(ج) ادب برائے ادب ہی سچا نظریہ ہے۔ (د) آزادی کا جذبہ ادب کے لیے مضر ہے۔

2. شاہد احمد دہلوی کے رسالے کا کیا نام تھا۔

(ا) پیام (ب) نیا ادب (ج) ادب لطیف (د) شاہ جہاں

3. پنڈت نہرو نے الہ آباد کی کس کانفرنس میں تقریر کی۔

(ا) 1938ء (ب) 1937ء (ج) 1939ء (د) 1935ء

27.4 عروج

دسمبر 1938ء کے آخری ہفتے میں ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس کلکتہ میں ہوئی۔ اس کی صدارت ملک راج آنند نے کی۔ اس کانفرنس میں بنگالی زبان کے کئی اہم ادیب و شاعر شریک ہوئے۔ اردو' بنگالی' گجراتی' مراٹھی اور تامل ادب کے رجحانات پر تقریریں ہوئیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کو اس کانفرنس میں کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

دو ڈھائی سال کے اندر ترقی پسند ادیبوں کی تحریک تمام ہندوستانی زبانوں میں مقبول ہوگئی۔ اقبال' ٹیگور' پریم چند' عبدالحق' جواہر لال نہرو' سروجنی نائیڈو' آچاریہ نریندر دیو اور جے پرکاش نرائن جیسے دانشوروں نے ترقی پسندوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ہندوستان بھر کے نوجوان اس رجحان

Scanned with CamScanner

سے متاثر ہو رہے تھے۔ بنگالی زبان کے مشہور رسالے ''پرچے'' نے ترقی پسند ادیبوں کے مضامین اور نظموں کو اہتمام سے شائع کرنا شروع کیا۔ حیات اللہ انصاری جو کانگریس کے ترجمان ''ہندوستان'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہوں نے ترقی پسند ادیبوں وشاعروں کی تخلیقات کو شائع کیا۔ ترقی پسندوں نے خود اپنا رسالہ ''نیا ادب'' لکھنو سے جاری کیا۔ مجلس ادارت میں سبط حسن' علی سردار جعفری اور مجاز شامل تھے۔ ''نیا ادب'' بے حد مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت سے حوصلہ پا کر نوجوان ادیبوں نے اپنا ایک اشاعتی ادارہ امداد باہمی کے اصولوں پر ''حلقہ ادب'' کے نام سے قائم کیا۔ جس کے تحت سجاد ظہیر کی ''لندن کی ایک رات'' (ناول) حیات اللہ انصاری کی کہانیوں کا مجموعہ ''انوکھی مصیبت'' مجاز کا مجموعہ کلام ''آہنگ'' اور سردار جعفری کے افسانوں کا مجموعہ ''منزل'' شائع کیے گئے۔ جوش ملیح آبادی اپنا رسالہ ''کلیم'' بند کر کے نیا ادب کے ادارے میں شامل ہو گئے۔ ''نیا ادب'' عروج پر تھا۔ ملک راج آنند' ڈاکٹر عبدالعلیم اور احمد علی کی ادارت میں انگریزی ماہنامہ انڈین لٹریچر شائع کیا گیا۔ بنگالی زبان کا ''پرچھوتیا'' اور ''پرگتی'' مراٹھی کا ''چترا'' ہندی کا ''روپاب'' اور ''وپلو'' بھی مقبول حاصل کرنے لگے۔ ہندوستان کی ساری زبانوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریریں مقبول ہونے لگیں۔

تیسری کل ہند کانفرنس :

ترقی پسند مصنفین کی تیسری کل ہند کانفرنس مئی 1942ء میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم کا خطرہ سر پر تھا۔ بین الاقوامی سیاسی حالات بہت ہی نازک موڑ پر آ گئے تھے۔ ترقی پسند ادیب فاشزم کے خلاف اور جمہوریت کی تائید میں پہلے ہی آواز اٹھا چکے تھے۔ اس کانفرنس میں وہ ادیب بھی شریک ہوئے جو ترقی پسند تحریک سے اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ خاص طور پر حلقہ ارباب ذوق جو ترقی پسند ادب کی تحریروں کو پروپگنڈہ کہتا تھا اور جو اشاریت و ہیئت پرستی سے متاثر تھے وہ بھی شریک ہوئے۔ اس میں سجاد ظہیر' ڈاکٹر عبدالعلیم' کرشن چندر' مجاز' سردار جعفری' سبط حسن اور رشید جہاں ایک طرف تھے تو دوسری طرف راشد' میرا جی' مولانا صلاح الدین احمد مدیر ''ادبی دنیا'' اور قیوم نظر وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ اس میں ترقی پسند ادیبوں نے قرارداد پیش کی کہ وہ فاشزم کے مخالف ہیں اور اتحادی اقوام کے ساتھ ہیں۔ لیکن ساتھ ہی برطانوی سامراج کے اس رویے کی مذمت بھی کی کہ وہ ان نازک حالات میں بھی ہندوستان کو آزادی دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ایک طرف تو ترقی پسند تحریک کو سراہا گیا لیکن چار پانچ سال میں نوجوان ادیبوں نے جس طرح کا ادب تخلیق کیا انہیں دیکھ کر ترقی پسند ادیبوں کے خلاف غلط فہمیاں پھیلنے لگیں۔ اس وقت اردو ادب میں کئی میلانات تھے کچھ لوگ مقصدیت کے حامی تھے۔ کچھ جدید ادبی تحریکوں سے متاثر تھے مثلاً اشاریت اور اظہاریت' فرائڈ' بودلیر' ملارمے وغیرہ کے نظریات انہیں اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ افسانوں میں تحلیل نفسی' لاشعوری کیفیات کا رجحان' شاعری میں ایہام' نئی ہیئت کی تلاش کا رجحان پرورش پانے لگا۔ شاعری میں ہیئت کے تجربے کیے جانے لگے جس کے نتیجے میں ترقی پسندی ایک مبہم اصطلاح بن گئی تھی۔

ترقی پسند ادب کے خلاف مضامین اور اس کے جواب میں وضاحت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی' رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کے خلاف اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے انقلابی شاعری میں تخریبی رجحانات' نعرہ بازی پر اور فحاشی وعریاں نویسی پر سخت اعتراضات کیے۔ رشید احمد صدیقی نے ترقی پسند ادب کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا جو رجحانات خلط ملط ہو رہے تھے انہیں پہچانا گیا۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند میں تمیز کی جانے لگی۔ ترقی پسند ادب اور نیا ادب یا جدید ادب کو الگ الگ دیکھا جانے لگا۔ رشید احمد صدیقی اور اثر لکھنوی وغیرہ کے مضامین کے جوابات احتشام حسین' سجاد ظہیر' علی جواد زیدی وغیرہ نے دیے۔ ترقی پسند تحریک کے بارے میں دوسری بحث اس وقت شروع ہوئی جب ماہر القادری نے ''اردو اصلاح ادب کانفرنس'' منعقد کی۔ اس کانفرنس میں بلینک ورس کی مخالفت کی گئی۔ آزاد نظم کے شاعروں کی پیروڈی کی گئی۔ آزاد نظم کے خلاف مضامین لکھوائے گئے۔ عندلیب شادانی مسعود حسن رضوی اور نیاز فتح پوری نے آزاد نظم کو اردو شاعری کے مزاج کے خلاف بتایا۔ محمد حسن عسکری نے آزاد نظم کی پیروڈی کی سخت مذمت کی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے بھی ایک تفصیلی مضمون تین قسطوں میں ''ترقی پسند ادب کے بارے میں چند غلط فہمیاں'' لکھا۔ انہوں نے بڑے مدلل انداز میں لکھا کہ آزاد نظم اردو مزاج کے خلاف نہیں ہے۔ انہوں نے آزاد نظم نگاروں کے

Scanned with CamScanner

یہاں ابہام اور فراریت کے جو رجحانات تھے ان کا بھی تجزیہ کیا۔ انہوں نے یہ بھی وضاحت کی کہ ہیت اور اسلوب کے سلسلے میں ترقی پسندوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ انہوں نے لکھا کہ انہیں ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہیے جو حال اور مستقبل کی ضروریات کو پورا کر سکے۔

جن دنوں یہ مباحث چل رہے تھے حیدرآباد میں کل ہند اردو کانگریس کا اجلاس ہوا۔ جس میں سجاد ظہیر کو ترقی پسند تحریک پر مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ اس مقالے میں سجاد ظہیر نے غلط فہمیوں کا انسداد کرنے کی کوشش کی اور ترقی پسند تحریک کی پالیسی بھی واضح کی۔

1944-43ء میں قحط بنگال کا اہم واقعہ ہوا۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں و شاعروں نے اسے موضوع بنا کر ظلم اور بہیمیت کے خلاف سخت احتجاج کیا۔

اکتوبر 1945ء میں ترقی پسند اردو مصنفین نے حیدرآباد میں ایک کانفرس بلائی چوں کہ اردو زبان اور ادب کے مسائل پر تفصیلی مباحث کا موقع نہیں مل رہا تھا اس لیے یہ کانفرنس منعقد کی گئی۔ یہ کانفرنس پانچ دن تک چلتی رہی۔ اس میں اردو کے تقریباً تمام اہم ادیب موجود تھے۔ اس کا افتتاح سروجنی نائیڈو نے کیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اردو ہندی کے اجلاس کی صدارت کی۔ فراق گورکھپوری نے شاعری کے اجلاس کی، قاضی عبدالغفار نے صحافت کے اجلاس کی، احتشام حسین نے تنقید کے اجلاس کی اور مولانا حسرت موہانی نے عام اجلاس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس کے متعلق کرشن چندر نے ایک دلچسپ رپورتاژ ''پودے'' لکھا۔

اس کانفرنس کی اہم قرارداد ڈاکٹر عبدالعلیم نے فحاشی کے خلاف پیش کی۔ اس قرارداد میں کہا گیا کہ اردو ادب میں جو فحاشی کے رجحانات پرورش پا رہے ہیں اس کا ترقی پسند تحریک اور ترقی پسند ادب کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب فحاشی کے خلاف ہیں اور اس کے اظہار کو ادب کے لیے غیر صحت مند اور مضر سمجھتے ہیں۔ اس تجویز کی قاضی عبدالغفار نے مخالفت کی اور کہاں ہمیں اس قسم کی کوئی تجویز پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ کسی قسم کے سخت احتساب کی ضرورت ہے۔ جنسی موضوعات پر بھی ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ بشرط یہ کہ لکھنے والے کا زاویہ نگاہ تعمیری اور ترقی پسندانہ ہو۔ جنس بھی ہمارے سماج کے اہم مسائل میں ہے۔ اس تجویز سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ ترقی پسند نوجوان اس موضوع اور زندگی کے اس پہلو کو خارج سمجھ کر اس سے قطع تعلق کر لیں۔ اس قرار کی سب سے زیادہ مخالفت مولانا حسرت موہانی نے کی۔ انہوں نے کہا کہ ''ادبی تخلیقات میں لطیف ہوسنا کی کا اظہار، کوئی مضائقہ نہیں'' اس پر قرارداد مسترد ہو گئی۔

تقسیم ہند کے بعد ترقی پسند ادیبوں نے دسمبر 1947ء میں لکھنو میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ تین دن تک مختلف اجلاس ہوئے اور ایک شاندار مشاعرہ بھی ہوا۔ کانفرنس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد کو مدعو کیا گیا لیکن وہ کسی وجہ سے شرکت نہ کر سکے۔ افتتاح کی رسم ڈاکٹر سید محمود نے ادا کی۔ عام جلسے کی صدارت قاضی عبدالغفار نے کی، مجلس مقالات کی صدارت رشید احمد صدیقی نے کی۔ ایک اجلاس خاص طور پر زبان کے مسئلے پر کیا گیا جس کی صدارت نیاز فتح پوری نے کی۔ مشاعرے کی صدارت حضرت اثر لکھنوی نے کی۔ انجمن کا تنظیمی جلسہ بھی ہوا جس میں یہ طے ہوا کہ ایک مرکزی دفتر بمبئی میں باقاعدہ قائم کیا جائے اور سردار جعفری کو عارضی طور پر جنرل سکریٹری بنایا جائے۔

مئی 1949ء میں ترقی پسند ادیبوں نے پانچویں کل ہند کانفرنس بھیونڈی میں منعقد کی۔ اس کانفرنس کے بعد ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں ایک نیا موڑ آیا۔ کیوں کہ 1936ء کے مینی فیسٹو کو ناکافی سمجھ کر ایک نیا مینی فیسٹو منظور کیا گیا۔ اس زمانے میں تلنگانہ اور بنگال کی عوامی تحریکوں اور حکومت کی سیاسی پالیسی کی وجہ سے بہت سے ترقی پسند ادیب قید تھے جو جیل سے باہر تھے، وہ کشمکش میں تھے کہ حکومت کا ساتھ دینا چاہیے یا نہیں۔ سب سے اہم مسئلہ تیسری جنگ عظیم کا خطرہ تھا۔ ترقی پسند علی الاعلان امن پسند طاقتوں کا ساتھ دینے اور سرمایہ دارانہ مفاد کی خاطر دنیا کو جنگ کے نام میں جھونکنے والی طاقتوں سے کنارہ کشی کا اظہار کرنا چاہتے تھے۔ نئے منشور میں ان تمام مسائل کا احاطہ کیا گیا۔

نئے منشور میں کہا گیا کہ آج ترقی پسند اور رجعت پسند ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہیں۔ اس میں وہ جدوجہد صاف دکھائی دے رہی ہے جو ہندوستان کے عوام جمہوریت اور اشتراکیت کے لیے کر رہے ہیں۔

Scanned with CamScanner

حکومت ہند کے اس فیصلے کی مخالفت کی گئی جس میں حکومت نے برطانولمی کامن ویلتھ میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کو آزاد خودمختار اور عوامی جمہوریت قائم کرنا چاہیے۔

سرمایہ دار ممالک امریکہ اور برطانیہ' سوویت یونین' پوربی یورپ کی عوامی جمہوریتوں اور ایشیا کے عوام کی جدوجہد کے خلاف جھوٹی خبریں پھیلا رہے ہیں۔

ہندوستان کا سرمایہ دارانہ طبقہ مزدوروں' کسانوں' فن کاروں پر ظلم ڈھا رہا ہے اور حکومت ان کے ساتھ ہے۔ مزدوروں' کسانوں اور متوسط طبقے کی جدوجہد کو دبانے کی بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ حکومت جمہوری اخباروں اور رسالوں کو بند کررہی ہے۔

سوویت یونین کی تعریف کی گئی جہاں اشتراکی سماج میں سرمایہ داروں کی آزادی ختم کی جاچکی ہے کہ وہ عوام کو دبا سکیں اس لیے وہاں جمہوریت پسندوں کو پوری آزادی ہے۔ سوویت یونین کا ادب اس وقت دنیا بھر کے ترقی پسندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

ترقی پسند ادیبوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ عوام کے قریب آئیں۔ اعلیٰ سماجی مقصد کے بغیر ادب عظیم نہیں ہوسکتا۔ ادیبوں کو اپنی تحریروں میں سنجیدگی اختیار کرنے کے لیے کہا گیا۔ عوامی ادب اور کلچر کا مستقبل ترقی پسندوں کے ہاتھوں میں ہے اس کا یقین دلایا گیا۔ ترقی پسند ادیبوں سے کہا گیا کہ وہ عوام سے رشتہ جوڑیں۔ مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور جدوجہد کی عکاسی کریں۔ رومانوی اور رجعت پرست ادیبوں کے نظریے اور عمل کے ساتھ سمجھوتہ بازی سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔ اس کانفرنس میں ہندی کے مشہور نقاد رام بلاس شرما کو کل ہند انجمن کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔

نئے منشور کی اشاعت کے بعد سردار جعفری نے ایسے شاعروں سے بیزاری کا اظہار کیا جو رمزیت اور تغزل کے قائل تھے۔ انہوں نے فیض احمد فیض کی نظم ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' پر اعتراض کیا۔ سردار جعفری نے فیض اور جذبی پر اعتراض کیا اور کیفی اعظمی و جان نثار اختر کو ترقی پسند قرار دیا۔ اس منشور اور سردار جعفری کے رویّے سے لکھنے والے تذبذب کا شکار ہوگئے۔

نقوش' ماہ نو' آج کل اور نیا دور جیسے ادبی رسائل کا بائکاٹ کیا گیا۔ بعض ادیبوں نے اس زمانے میں لکھنا چھوڑ دیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ترقی پسند تحریک کے ترجمان ''شاہراہ'' کا تنزل شروع ہوگیا۔ ترقی پسندوں میں ''ادبی جمود'' پر بحث ہونے لگی۔

اپنی معلومات کی جانچ

1 ترقی پسندوں کے رسالے کا نام کیا تھا؟

(ا) پرچم (ب) نیا ادب (ج) سرخ سویرا (د) حیات

2 مسعود حسن رضوی' عندلیب شادانی اور نیاز فتح پوری نے کس صنف کو اردو کے مزاج کے خلاف بتایا؟

(ا) غزل (ب) مثنوی (ج) آزاد نظم (د) نظم معریٰ

3 نیا منشور کس کانفرنس میں جاری کیا گیا؟

(ا) حیدرآباد کانفرنس (ب) بھیمڑی کانفرنس (ج) لکھنؤ کانفرنس (د) الہ آباد کانفرنس

27.5 زوال

مارچ 1952ء میں ترقی پسند ادیبوں نے دہلی میں ایک کانفرنس منعقد کی۔ خوب مباحث ہوئے اور ایک نیا منشور منظور کیا گیا۔ اس میں کہا گیا کہ :

Scanned with CamScanner

اکائی : 28 حلقۂ اربابِ ذوق

ساخت

28.1 تمہید

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

28.4 خلاصہ

28.5 نمونہ امتحانی سوالات

28.6 فرہنگ

28.7 سفارش کردہ کتابیں

28.1 تمہید

یہ اکائی اردو شعر و ادب کے ایک اور نظریاتی ادارہ ''حلقۂ اربابِ ذوق'' سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اس اکائی میں آپ کو اُس پس منظر سے واقف کرائیں گے جس کے باعث حلقۂ اربابِ ذوق کا وجود ہوا۔ حلقہ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور اسی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعری و ادبی میلانات اور رجحانات پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ حلقہ کے امتیازی پہلو بھی زیرِ بحث آئیں گے۔ ہم اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ آپ اپنی معلومات کی جانچ بھی کریں گے۔ امتحانی سوالات بھی درج کیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔ امید ہے آپ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

1935ء کے لگ بھگ بلکہ یوں کہیے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی، ہندوستانی معاشرہ میں انتشار، اختلال، افراتفری، پریشانی، بکھراؤ اور خلجان کا زمانہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز بلکہ اس سے کچھ پہلے بھی دیکھیں تو حالات کچھ اور سمت، کچھ اور موڑ اور کچھ اور رنگ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ 1830ء کے اس واقعہ کا ہلکا سا تذکرہ ہو جائے کہ راجہ رام موہن رائے یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے فرانسیسی جہاز سے جانے پر اصرار کیا کہ وہ فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھے۔ پھر 1905ء اور 1917ء میں روسی انقلاب ہوئے۔ بلقان کے ہنگامے بھی اسی زمانے کی بات ہیں جس میں ہندوستانیوں نے ترکوں سے عدم تعاون کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اثرات ساری دنیا پر ترتیب پائے۔ 1933ء کی بات ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں فاشزم کی تحریک کی سرگردگی کی۔ ہونے والی دوسری جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ سیاسی کشمکش کا دور تھا۔ اقتدار کے لیے آویزش افزوں ہوتی جا رہی تھی۔ بڑی طاقتیں دنیا کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنی گرفت میں رکھنے کے جنون میں تھیں، بین الاقوامی بحران شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور اسلحہ کی دوڑ نے ترقی یافتہ ممالک کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے آواز بلند کی۔ یورپ کے روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں میں فاشزم کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ ہٹلر نے کئی شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں وغیرہ کو یا تو قتل کرا دیا تھا یا جلاوطن۔ ایسے میں 1935ء میں ادیبوں وغیرہ کی کانفرنس ہوئی ہے۔ بعد ازاں لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اپنی کانفرنس کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا مینی فیسٹو تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ جب ہندوستان واپس ہوتے ہیں تو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علم نفسیات کو قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات عام ہونے لگتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے فرد کے جذبات و احساسات کو کم اہمیت دی تھی بلکہ نظر انداز کر دیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی اور ترقی پسند فنکار، پارٹی پروگرام اور اس کی حکمتِ عملی کو روبہ عمل لانے کے پابند۔

Scanned with CamScanner

اکائی : 28 حلقہ اربابِ ذوق

ساخت

28.1 تمہید

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

28.4 خلاصہ

28.5 نمونہ امتحانی سوالات

28.6 فرہنگ

28.7 سفارش کردہ کتابیں

28.1 تمہید

یہ اکائی اردو شعر و ادب کے ایک اور نظریاتی ادارہ ''حلقہ اربابِ ذوق'' سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اس اکائی میں آپ کو اُس پس منظر سے واقف کرائیں گے جس کے باعث حلقۂ اربابِ ذوق کا وجود ہوا۔ حلقہ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی اور اسی کے ساتھ حلقۂ اربابِ ذوق کے شعری و ادبی میلانات اور رجحانات پر بھی گفتگو کی جائے گی۔ حلقہ کے امتیازی پہلو بھی زیرِ بحث آئیں گے۔ ہم اس اکائی کا خلاصہ بھی پیش کریں گے۔ آپ اپنی معلومات کی جانچ بھی کریں گے۔ امتحانی سوالات بھی درج کیے گئے ہیں اور آپ کے مزید مطالعہ کے لیے سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے۔ امید ہے آپ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

28.2 حلقۂ اربابِ ذوق: پس منظر، قیام، سرگرمیاں

1935ء کے لگ بھگ بلکہ یوں کہیے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی، ہندوستانی معاشرہ میں انتشار، اختلال، افراتفری، پریشانی، بکھراؤ اور خلجان کا زمانہ تھی۔ بیسویں صدی کے آغاز بلکہ اس سے کچھ پہلے بھی دیکھیں تو حالات کچھ اور سمت، کچھ اور موڑ اور کچھ اور رنگ اختیار کرتے جا رہے تھے۔ 1830ء کے اس واقعہ کا ہلکا سا تذکرہ ہو جائے کہ راجہ رام موہن رائے، یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے فرانسیسی جہاز سے جانے پر اصرار کیا کہ وہ فرانسیسی انقلاب سے متاثر تھے۔ پھر 1905ء اور 1917ء میں روسی انقلاب ہوئے۔ بلقان کے ہنگامے بھی اسی زمانے کی بات ہیں جس میں ہندوستانیوں نے ترکوں سے عدم تعاون کیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے اثرات ساری دنیا پر ترتیب پائے۔ 1933ء کی بات ہے کہ ہٹلر نے جرمنی میں فاشزم کی تحریک کی سرگردگی کی۔ ہونے والی دوسری جنگ عظیم کے خطرات منڈلانے لگے تھے۔ سیاسی کشمکش کا دور تھا۔ اقتدار کے لیے آویزش افزوں ہوتی جا رہی تھی۔ بڑی طاقتیں دنیا کے زیادہ سے زیادہ حصہ کو اپنی گرفت میں رکھنے کے جنون میں تھیں، بین الاقوامی بحران شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اور اسلحہ کی دوڑ نے ترقی یافتہ ممالک کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں نے آواز بلند کی۔ یورپ کے روشن خیال اور ترقی پسند حلقوں میں فاشزم کے خلاف ردِ عمل ہوا۔ ہٹلر نے کئی شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں وغیرہ کو یا تو قتل کرا دیا تھا یا جلاوطن۔ ایسے میں 1935ء میں ادیبوں وغیرہ کی کانفرنس ہوئی ہے۔ بعد ازاں لندن میں مقیم ہندوستانی طلبہ جنھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی اپنی کانفرنس کرتے ہیں اور ترقی پسند تحریک کا مینی فیسٹو تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طلبہ جب ہندوستان واپس ہوتے ہیں تو لکھنؤ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوتی ہے اور یہ سلسلہ چل نکلتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں علم نفسیات کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ فرائیڈ اور یونگ کے نظریات عام ہونے لگتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے فرد کے جذبات و احساسات کو کم اہمیت دی تھی بلکہ نظر انداز کر دیا تھا۔ ترقی پسند مصنفین کو کمیونسٹ پارٹی کی سرپرستی حاصل تھی اور ترقی پسند فنکار، پارٹی پروگرام اور اس کی حکمتِ عملی کو روبہ عمل لانے کے پابند۔

Scanned with CamScanner

معاشرہ کو اہمیت دی جا رہی تھی اور فرد کو معاشرہ کا آلہ کار بنا دیا گیا تھا۔ اس کا ردعمل ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ دروں کی سیاحت کا رجحان عام ہوا۔ فرد کے جذبات و احساسات کو پہچاننے اور ان کا احترام کرنے پر زور دیا گیا۔ حالات بھی کچھ ایسے ہی موڑ کے متقاضی ہوتے جا رہے تھے اور کچھ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر حلقۂ اربابِ ذوق کا قیام عمل میں آیا۔

''بزم افسانہ گویاں'' کے نام سے پہلے ایک انجمن قائم کی گئی اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ بزم صرف افسانے تک محدود تھی لیکن بعد میں یعنی 29 اپریل 1939ء کو ترقی پسند تحریک کے قیام کے لگ بھگ تین سال بعد نام تبدیل کر کے حلقہ اربابِ ذوق کی تشکیل کی گئی اور قیوم نظر اور یوسف ظفر کے حلقہ میں شامل ہونے کے بعد شاعری اور شاعری کی تنقید کو بھی یہاں جگہ ملی اور اس کے دائرہ کار میں بتدریج توسیع ہوتی گئی۔ ڈرامے نے بھی جگہ پائی۔ معریٰ اور آزاد نظم کو مقام ملنا ہی تھا۔ غزل کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ غرض جلد ہی ایک جامع پیرایہ میں حلقہ اربابِ ذوق نے اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کا قیام چونکہ لاہور میں عمل میں آیا تھا اس لیے اس کو عموماً پنجاب کا حلقہ متصور کیا گیا لیکن جلد ہی یہ غلط فہمی دور ہو گئی اور برصغیر کے دیگر علاقے کے قلم کاروں نے بھی اس میں یا تو شرکت کی یا اپنا تعاون دیا۔ ''بزم افسانہ گویاں'' کے بانی ارکان میں شیر محمد اختر، تابش صدیقی اور نصیر احمد وغیرہ تھے لیکن پھر میرا جی، ممتاز مفتی، مختار صدیقی اور دیگر نے بھی اس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ میرا جی نے بعد میں حلقہ اربابِ ذوق کی رکنیت لی۔ حلقہ کے ریکارڈ کے مطابق میرا جی نے سب سے پہلے 25 اگست 1940ء کو حلقہ کے جلسہ میں شرکت کی لیکن چونکہ میرا جی کی وجہ سے حلقہ کو ایک واضح ادبی رجحان ملا اور اس کی کشش کا باعث وہی ہوئے اس لیے حلقہ اربابِ ذوق کا نام لیتے ہی میرا جی کا نام آ جاتا ہے۔ ہر چند کہ اس کے ارکان میں بیدی، ہنس راج رہبر، کنہیالال کپور، پرکاش پنڈت اور بیگم سکینہ محمود کے نام بھی ہیں اور دہلی میں اس کی جو شاخ قائم ہوئی اس کے معتمد ڈاکٹر عبادت بریلوی ہوئے۔ بعد ازاں دھیرے دھیرے خاص طور پر شمالی ہند کے کئی علاقوں میں حلقہ کو وسعت حاصل ہوتی گئی۔ حلقہ کے ارکان کی ہمیشہ یہ مساعی رہی کہ حلقہ کے مقاصد میں توسیع کی جائے اور ارکان کی تعداد میں اضافہ ہو۔

حلقہ کا اہم مسئلہ جلسوں کے لیے مقام کا حصول تھا۔ ابتداً یہ جلسے ارکانِ حلقہ کی رہائش گاہوں پر ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ پہلا جلسہ نصیر احمد جامعی کی رہائش گاہ عقب لکشمی مینشن پر منعقد ہوا۔ پھر یہ جلسے کبھی بدر الزماں کے دفتر پر ہوئے جو امپورٹ، ایکسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے اور کبھی مصری شاہ میں واقع تابش صدیقی کے مکان پر۔ 1944ء میں کہیں یہ طے کیا گیا کہ یہاں وہاں جلسے کرنے کی بجائے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں جلسے ہوا کریں۔ یہ سلسلہ تا دیر چلتا رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق نے صرف ادبی اجتماعات ہی کا انعقاد نہیں کیا بلکہ عملی طور پر بھی شعر و ادب کے فروغ میں اپنا حصہ ادا کرنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کو آگے بڑھانے کے لیے میرا جی کے غیر معمولی حصہ کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ 1941ء کی بہترین نظموں کا انتخاب کیا گیا اور اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ اس انتخاب میں (24) نظمیں ہیں جو احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، مختار صدیقی، ن۔ م۔ راشد، جوش، عدم، اختر شیرانی، سلام مچھلی شہری، شاد عارفی، میرا جی، اختر الایمان اور راجہ مہدی علی خاں جیسے فن کاروں کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور فیض جیسے شاعروں کی شمولیت اس امر کی غماز ہے کہ حلقہ نے ابھی ایسی صورت نہیں لی تھی اور ترقی پسندوں اور حلقہ کے افراد کے درمیان کوئی خطِ فاصل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ اس انتخاب کا ابتدائیہ (پیش لفظ) میرا جی نے لکھا تھا میرا جی کے باعث حلقہ کے رنگ روپ میں فرق ضرور آیا لیکن بنیادی طور پر جیسا کہ یونس جاوید نے لکھا ہے: ''1941ء تا 1947ء تک حلقۂ اربابِ ذوق کی مجالس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہوئی نہ مباحث کے رنگ بدلے نہ ہی تنقید میں کوئی نقطۂ نظر واضح ہو کر سامنے آ سکا۔ البتہ 1941ء تا 1949ء تک کی بہترین نظمیں'' کے عنوان سے منتخب نظموں کے جو مجموعے شائع کیے گئے ان میں ہم حلقہ سے منسلک ادیبوں کی فنی بصیرت اور شعری ادراک کا عکس ضرور دیکھتے ہیں۔ ابتدا میں حلقہ ان شعری انتخابات کو اپنے طور پر ہی شائع کرتا تھا اور ناشر اس طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ نئی نظم ابھی تک ان کے ہاں اعتبار نہیں پائی تھی لیکن ''1943ء کی بہترین نظمیں'' کو مکتبہ اردو نے شائع کیا۔ گویا اب وہ بھی نئی نظم کی توانائی، تازگی اور مقبولیت سے متاثر ہو چکے تھے۔ نئی نظم کی مقبولیت اور حلقہ کے بڑھتے ہوئے اثر کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ ناشروں نے حلقہ سے پانچ سال تک کے انتخابات شائع کرنے کا معاہدہ کر لیا اور مشمولات کے تعلق سے ناشروں کے اعتراضات اور تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتخابات کی اشاعت عمل میں آنے لگی۔ تقسیم ہند کا وقت قریب آ رہا تھا، شمالی ہند میں فسادات شروع ہو چکے تھے اس کا اثر حلقہ کے جلسوں اور شرکا کی تعداد پر بھی پڑا۔ چنانچہ مارچ 1947ء میں منعقدہ جلسے میں وحید قریشی، یزدانی ملک اور حفیظ ہوشیار پوری نے جن کو اس جلسہ میں مضامین پڑھنے تھے اس لیے شرکت نہیں کی کہ لاہور میں فسادات کی وجہ سے

حالات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بعد بھی دو، تین جلسے فرقہ وارانہ فسادات اور ناگزیر حالات کی بنا پر منعقد نہیں ہو سکے۔ فسادات کے بعد پہلا جلسہ 14 ستمبر 1947ء کو منعقد ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ بعد ازاں 3 نومبر 1949ء کو میراجی کے انتقال نے حلقہ کے موقف، اس کے استحکام اور انہیج کو نقصان پہنچایا۔ یوں بھی تقسیم ہند کے بعد بدلے ہوئے حالات میں حلقہ کو اپنا توازن برقرار رکھنا دشوار تھا۔ بہترین نظموں کا ہر سال جو انتخاب شائع ہوتا تھا، اس سلسلے میں 1949ء کی بہترین نظموں کا انتخاب شائع ہوا جو میراجی کے انتقال کے بعد پہلا اور اس سلسلے کا آخری انتخاب تھا۔ اس کے بعد نہ تو کوئی ناشر اس کے لیے آمادہ ہوا اور نہ ہی حلقہ اس کے مصارف برداشت کر سکا۔

منتخب نظموں کی اشاعت کا سلسلہ تو مسدود ہو گیا لیکن ادبی ذوق کی تسکین کے لیے حلقہ نے اپنا مرتب کردہ جریدہ ''نئی تحریریں'' شائع کیا جس کی پہلی جلد 1948ء میں کراچی سے اور دوسری جلد 1954ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ حلقہ کے ترجمان ''نئی تحریریں'' کے صرف چار شمارے لاہور سے شائع ہوئے۔ البتہ اس دوران 1956ء میں "1955ء کی بہترین نظمیں'' کی اشاعت عمل میں آئی جس پر حلقہ کا نام تو درج نہیں تھا البتہ اس کے مرتب قیوم نظر تھے۔ حلقہ کا نام نہ ہونے کی اور کوئی وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ حلقہ میں گروہ بندی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اختلافات شدت اختیار کرنے لگے تھے۔ اس کا اظہار یوں ہوا کہ انتظار حسین، عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم کو ان کی ''انتہا پسندانہ سرگرمیوں'' کی بنا پر حلقہ کی رکنیت سے علحدہ کر دیا گیا۔

حلقہ کے جلسوں میں نظموں کے ساتھ افسانے بھی پیش کیے جانے لگے۔ چنانچہ اعجاز حسین بٹالوی نے افسانہ ''گرل فرینڈ'' 27 نومبر 1955ء کے جلسہ میں پیش کیا۔ سعادت حسین منٹو نے بھی 3 ستمبر 1950ء سے کئی جلسوں میں اپنے افسانے سنائے جن پر کھل کر تنقید ہوئی۔ شاہ دولے کا چوہا'' منٹو کا آخری افسانہ تھا جو انہوں نے حلقہ کے 30 مئی 1954ء کے اجلاس میں پڑھا۔ پھر منٹو کے انتقال کے بعد ہی 23 جنوری 1955ء کو حلقہ کا اجلاس ہوا۔ اس مدت میں نہ صرف بہترین نظموں کے انتخابات شائع ہوئے بلکہ ''بہترین شاعری، بہترین افسانے'' اور بہترین مقالے بھی شائع کیے گئے۔ ان سب کے ناشر تھے مکتبہ جدید لاہور۔ ابھی چند سال بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ حلقہ کے اختلافات مزید ابھرے اور 12 مارچ 1972ء کو حلقہ دو حصوں میں منقسم ہو گیا اور جس گروہ نے قطع تعلق کیا اس نے اپنا نام حلقہ ارباب ذوق (ادبی) رکھا۔ یہ گروہ ادب کو خالص ادب کے حوالے سے جانچتا پرکھتا تھا۔ دوسرا خالص سیاسی نقطہ نظر سے۔ اس طرح ادب اور سیاست ان کی شناخت بن گئی۔ اس کے بعد کے اتوار سے حلقہ ارباب ذوق (ادبی) کے جلسے پاک ٹی۔ ہاؤس میں منعقد ہونے لگے جن میں 1977ء تک باقاعدگی رہی۔ بعد میں 1979ء تک بے قاعدگی سے چلتے رہے۔ یہی شب و روز تھے کہ 1980ء میں حلقہ ارباب ذوق (پاکستان) شاخ لاہور کا قیام عمل میں آیا جس کے اجلاس 30 مئی 1980 سے 4 اگست 1980 تک منعقد ہوئے لیکن یہ حلقہ جلد ہی معطل ہو گیا اور مارچ 1982ء میں یہ صورت رہی کہ تین حلقے اپنے جلسے منعقد کرنے لگے۔ حلقۂ ارباب ذوق لاہور (پاکستان) حلقۂ ارباب ذوق (سیاسی) اور حلقۂ ارباب ذوق (قیوم گروپ)۔ ان میں حلقۂ ارباب ذوق (پاکستان) اور حلقۂ ارباب ذوق (سیاسی) کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش اپریل 1983ء میں شروع ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ دونوں حلقے اپنے اپنے اجلاس منعقد کرنے اور ایک دوسرے کو غیر آئینی بھی قرار دیتے رہے آج بھی حلقۂ ارباب ذوق کسی نہ کسی نام اور رنگ سے موجود ہے اور کئی ہیں۔ ان کی حیثیت آئینی ہے یا نہیں یہ اور بات ہے لیکن یہ بات طے ہے کہ ترقی پسند تحریک کی طرح اس کی سرگرمیاں بھی برائے نام رہ گئی ہیں اور ترقی پسند تحریک ہی کی طرح حلقہ ارباب ذوق ہماری ادبی تاریخ کا حصہ بن کر رہ گیا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ

1. حلقۂ ارباب ذوق کا قیام کب عمل میں آیا اور کہاں؟
2. حلقۂ کے ابتدائی ارکان کے نام لکھیے۔
3. میراجی سے حلقۂ ارباب ذوق کا کیسا تعلق رہا؟

28.3 حلقۂ اربابِ ذوق: رجحانات

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ہمارا قومی ہی نہیں، سیاسی، معاشرتی اور ادبی منظر نامہ بدل رہا تھا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آتے آتے یہ پوری طرح واضح اور روشن تر ہو گیا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہونا ہی تھا سو ہوا اور اس کے ردِ عمل کے طور پر حلقۂ ارباب ذوق کے قیام پر بھی کسی کو

Scanned with CamScanner

...ب ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت بلاشبہ اس موڑ کا متقاضی تھا ترقی پسند تحریک کا آغاز خاصے زور و شور سے ہوا۔ ترقی پسندوں نے ادب برائے زندگی کا ...خلصانہ طور پر بلند کیا ہو انہوں نے فرد کے جذبات و احساسات کو نظر انداز نہ بھی کیا ہو بہر کیف ان کو کم اہمیت ضرور دی۔ ویسے نثر اور شاعری سے ایسی ...لیں مل جائیں گی جن میں فرد کے جذبات و احساسات کی دلنواز تصویر کشی اور موثر ترجمانی کی گئی ہے لیکن یہ ترقی پسند تحریک نہیں ہندوستان کے عوامی مزاج اور ہندوستانی زبانوں کے ادب کی صدیوں پرانی روایات کا اثر تھا جو ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر اور خمیر میں شامل تھیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک ہندوستان کی نئی نسل کے ذہنوں کی نمائندگی کرتی ہو لیکن اس پر پیرس اور لندن کی فضاؤں کا بھی اثر تھا۔ اس پس منظر کے باوجود ترقی پسند تحریک کی یہ زبردست کامیابی تھی کہ اس نے کئی دلوں کو مسخر کر لیا۔ تاہم کئی ذہن ایسے بھی تھے جو اس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایسے نقاط نظر رکھنے والوں کے نزدیک اظہار ذات' انفرادی جذبات اور احساسات کی ترجمانی' انسانی نفسیات کی تحلیل' واردات قلبی کا انکشاف اور اس کی ترسیل کے بغیر ادب کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ لہذا ایسے فن کار جو اِن میلانات کے حامل تھے ترقی پسند تحریک میں ان کو نہ پاتے ہوئے حلقہ ارباب ذوق کے قیام پر مائل ہوئے۔ ترقی پسندوں نے اور ان میں خاص طور پر سردار جعفری اور سجاد ظہیر نے حلقۂ اربابِ ذوق کو شدت سے نشانہ بنایا۔ سردار جعفری نے "ترقی پسند ادب" میں حلقۂ اربابِ ذوق کے ادیبوں کو ہیئت پرست' ابہام پرست اور جنس پرست ادیب قرار دیا جو یورپ کے انحطاطی ادب سے متاثر تھے سجاد ظہیر نے "روشنائی" میں "میرا جی" کو انگلستان کے جدید رجعت پرستوں کا چربہ قرار دیتے ہوئے حلقہ اربابِ ذوق کی مجہولیت کا ذکر کیا۔ یہ زاویہ حلقۂ اربابِ ذوق کے قابل قبول نہیں رہا۔

حلقۂ اربابِ ذوق کو یورپ اور انگلستان سے وابستہ کر دینا درست نہیں۔ خارجی اثرات کی اہمیت مسلم لیکن داخلی محرکات بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں جس طرح ترقی پسندوں نے روس اور فرانس کے اثرات قبول کیے حلقہ اربابِ ذوق والوں نے بھی فرانس اور انگلستان کے اثرات زیادہ قبول کیے۔ ہاں زندگی اور ادب کے بارے میں حلقۂ اربابِ ذوق کا رجحان قدرے بدلا ہوا تھا۔ انہوں نے زندگی کی کشاکش اور خارجی حالات کی کشمکش میں راست اور بھرپور حصہ نہ لیا ہو جس طرح نظریاتی طور پر ترقی پسند چاہتے تھے' حلقہ اربابِ ذوق نے ادبی اقدار کو ملحوظ رکھا اور چاہا کہ ادب پہلے ادب ہو اور ادبی اقدار کا احترام کیا جائے۔ آیئے ہم ادب کے بارے میں حلقہ ہی کے ایک ترجمان کے خیالات سے واقفیت حاصل کریں۔

> "ہمارے خیال میں ادب کی اولین خصوصیت یہی ہے کہ وہ اول اور آخر ادب ہو۔ ترقی پسندی اور رجعت پسندی بعد کی باتیں ہیں۔ جو چیز معیار پر پوری نہیں اترتی حلقہ کے نزدیک درخورِ اعتنا نہیں۔"
>
> (ادبی دنیا" لاہور جولائی 1945 ص 44)

یہ اول و آخر والی بات حلقہ کے بعض ارکان میں انتہا پسندانہ حد تک ملتی ہے۔ ایسے افراد ادب کے ساتھ زندگی کو حشو و زاید میں شمار کرتے ہیں۔ اس انتہائی پسندی نے جو ایک طرح کی شدید داخلیت پسندی یا اس کا ردعمل تھی حلقہ کو روشن خیال لوگوں میں معروف ہونے نہیں دیا۔ یہ رجحان انفرادی طور پر حلقہ کے سرگرم رکن میرا جی کے یہاں بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایک موقع پر انہوں نے لکھا ہے:

> "اگر دو ایک لمحوں کے لیے فن برائے حیات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہم کہیں گے کہ فن برائے فن کے بغیر فن ہی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ برائے حیات کا دم چھلا کیسا۔ حقیقت میں تہذیب و تمدن نے جن حشو و زواید کو ہم پر طاری کر دیا ہے ان ہی میں سے برائے حیات کا تصور بھی ایک چیز ہے لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کی باتیں زندگی کی ترجمان نہیں تھیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ حال کے بعض سیاسی نظریے اور سماجی و اقتصادی نظام کے موجودہ رنگوں سے واقف نہ تھے۔" (میرا جی: "دیباچہ" 1941ء کی بہترین نظمیں۔ مرتبہ: حلقہ اربابِ ذوق' لاہور۔ صفحہ 11)

بہر کیف بڑی حد تک یہ بات طے ہے کہ حلقہ اربابِ ذوق کی ادبی اقدار کو معاشرہ کے سرد و گرم سے اس نوع کا تعلق نہیں تھا جو ادب برائے زندگی کے کٹر حامیوں کا تصور ہے۔ ویسے ن۔ م۔ راشد نے جن کا حلقہ سے خاص تعلقِ خاطر تھا حلقہ کے رویہ کو نہایت معتدل اور متوازن انداز میں یوں بیان کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:

"جدید شاعری کی جس تحریک سے میں وابستہ ہوں اسؔ کے دو بنیادی مقاصد تھے۔ فارم کی جگڑ بندیوں سے اردو شاعری کو آزاد کرانا اور دوسرے

معاصر زندگی کی حقیقتوں سے قریب لانا۔'' اس سے حلقہ ارباب ذوق کے نصب العین کا اظہار ہوتا ہے کہ اس نے شعر و ادب اور معاصر زندگی کے رشتہ کو کس حد تک سمجھا اور اس پر زور دیا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ حلقہ ارباب ذوق نے فنکار کے انفرادی احساس پر زور دیا جس کی وجہ سے خارجیت اور بیرون کی داخلیت داخل اور درون کو اہمیت دی گئی۔ انھوں نے شعور کو نظر انداز کیا ہو لیکن تحت الشعور اور لاشعور کی باتیں ان کے یہاں زیادہ پائی جاتی ہیں اور ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں حلقہ کے شاعروں کے یہاں احساس ذات شدید ہے۔ حلقہ کے شاعروں کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ فرد اور معاشرہ کی کشمکش میں حلقہ ارباب ذوق نے معاشرہ کے مقابلہ میں فرد اور ذات کو اہمیت دی۔ تحلیل نفسی اور تحت الشعور اور لاشعور کے رجحانات نے ان فنکاروں کو اپنے درون میں جھانکنے اور داخل کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اسی کے ساتھ اپنی ذاتی کیفیات اور وارداتِ قلبی کو ظاہر کرنے کے لیے اسلوب میں نئے نئے تجربے کیے اور اوزان و بحور میں تبدیلیاں لائیں۔ چونکہ وہ اپنے تجربات اور واردات اور کیفیات کو من و عن اور تجریدی پیرایہ میں بیان کرنا چاہتے تھے اس لیے ان کو روایت کا سہارا لیتے ہوئے بھی روایت سے بغاوت کرنی پڑی۔ انھوں نے مروجہ اصطلاحات، استعارات، تشبیہات اور اشارات وغیرہ کو یا تو قطعی طور پر رد کر دیا یا ان کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ یہ تبدیلیاں اردو شاعری میں نئی ہی نہیں حیرت انگیز بھی تھیں چنانچہ اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ حلقہ ارباب ذوق نے افادیت اور مقصدیت سے اپنے رشتہ کو قطعی طور پر نہیں توڑا بات صرف اتنی ہے کہ انھوں نے ترقی پسند کی طرح موضوع کو مقصدیت کی زنجیر نہیں پہنائی۔ بلکہ عملی طور پر خود کو زندگی کے چند موضوعات تک محدود رکھا۔ میراجی نے ''1941ء کی بہترین نظمیں'' میں لکھا ہے کہ ''خیال یا موضوع کے اعتبار سے اس کی افادیت کو ملحوظ بھی رکھا گیا خواہ وہ افادیت انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو یا شعبہ سے تعلق رکھتی ہو یعنی نظری ہو یا عملی۔'' اس صراحت کی روشنی میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حلقہ ارباب ذوق کے ارکان نے زندگی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا۔ حلقہ ارباب ذوق کے ارکان نے اپنی ذات اور نج کو اہمیت ضرور دی لیکن خارج اور سماج کو نظر انداز بھی نہیں کیا۔ انھوں نے باغیانہ روش اختیار کی لیکن روایت کے احترام اور سماجی رشتہ کی پاسداری سے بھی گریز نہیں کیا اور تو اور میراجی کے یہاں بھی ''ابوالہول'' جیسی منظومات ملتی ہیں جن میں سماجی ورثہ کی تکریم پائی جاتی ہے اور ان پر اظہار افتخار بھی .....

الطاف گوہر نے جن کا حلقۂ ارباب ذوق میں خاصا عمل دخل رہا، حلقہ کی تشکیل کے چھ سال بعد حلقہ کے شعری طریقۂ کار کی صراحت کرتے ہوئے جن باتوں کی نشان دہی کی ہے ان میں سے چند درج کی جاتی ہیں کہ ان سے حلقہ کے موقف کا اظہار ہوگا۔

1. اچھی شاعری وہ ہے جو اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے ہمہ گیر تاثیر کی حامل ہو۔
2. شاعری اگر شاعری نہیں تو پھر جدید ہو یا قدیم سوختنی ہے۔
3. ہمارا احتجاج جمود کے خلاف ہے، روایات کے خلاف نہیں۔
4. شاعر کا واحد مقصد اپنے شدید طور پر محسوس کیے ہوئے تجربات کا مکمل اظہار ہے۔

واضح ہے کہ حلقہ کے نزدیک ماحول سے آگہی، نفسِ شاعری، روایات کی پاسداری اور شدید احساسات کی اہمیت ہے میراجی نے بھی ''اس نظم میں'' کے دیباچہ میں ادب کو زندگی کا ترجمان قرار دیا ہے وہ اپنے زاویہ سے ادب کو پیش کرنا چاہتے تھے اور ترقی پسند ادبی رجحانات سے فکری اختلاف کے باوجود ادب میں عصری زندگی کی عکاسی کے قائل تھے البتہ وہ اس کے خواہاں ضرور تھے کہ عصری مسائل اس طرح نہ پیش کیے جائیں کہ ادب صحافت بن جائے۔ اسی طرح ان کے ملحوظ نظریہ بات بھی تھی کہ ادب پہلے ادب ہو، فن پہلے فن ہو۔ شاعری میں شاعر کی ذاتی زندگی کے تجربات کی جھلک ہو۔ حلقہ نے تجربے پر زور دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ تجربہ نیا اور منفرد ہو۔ اسی طرح حلقہ نے موضوع کے انتخاب اور شاعر کے اندازِ نظر کو بھی اہمیت دی اور اس امر کی وضاحت کر دی کہ موضوع اچھوتا ہونا چاہیے اور اگر موضوع اچھوتا نہ بھی ہو تو کم از کم نظریہ جدید ہونا چاہیے۔ گویا حلقہ ارباب ذوق کے قلم کار یہ رجحان رکھتے تھے کہ جدت یا انفرادیت ہو تو کوئی فن پارہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ چونکہ ترقی پسندوں نے ایسی کسی جدت پر زور نہیں دیا اس لیے میراجی اس کمی کو ترقی پسند تحریک کا المیہ قرار دیتے ہیں۔ ان باتوں سے حلقہ ارباب ذوق کے اس میلان پر روشنی پڑتی ہے کہ تجربہ اور انفرادیت فن کے لیے بنیادی چیزیں ہیں۔ وہ اس معروف خیال سے اتفاق نہیں کرتے کہ شاعری نقل کی نقل کا نام ہے بلکہ وہ شاعری کو تخلیق قرار دیتے ہیں اور پھر بات وہیں پر آ جاتی ہے کہ فن پارے میں احساس، جذبہ یا تجربہ ہو اور اس کے اظہار میں جدت تاکہ جو بات ہو شاعر اپنے انداز سے کہے۔ حلقہ نے صرف تجربہ، جدت اور انفرادیت ہی پر زور نہیں دیا بلکہ اظہار اور ہیئت اسلوب میں بھی ان چیزوں کو ضروری قرار دیا۔ اس طرح نئی ہیئت اور نئے اسالیب کی گنجائش خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

Scanned with CamScanner

ہر چند کہ نظم نگاری کا تصور پہلے بھی تھا اور ترقی پسندوں نے بھی اس طرف توجہ دی تھی لیکن حلقہ والوں نے نظم کو "عضویاتی وحدت" کی شکل دیتے ہوئے اس کو غزل سے آزاد رکھنے کی کوشش کی اور اس کو ایک جمالیاتی تجربے کی حیثیت بھی دیدی۔ جہاں تک نظم کی ہیئت کا تعلق ہے اس بحث سے قطع نظر کہ آزاد نظم کو وسیلہ اظہار بنایا اور اس میں ایسے کئی تجربے کیے جس کی آزاد نظم متحمل ہو سکتی تھی چنانچہ قافیہ در قافیہ اور اندرونی قافیوں کا استعمال بھی عام ہوا، طویل اور مختصر مصرعوں کی طرف بھی توجہ دی گئی، جملوں، سطروں اور اصوات کی تکرار ہوئی۔ نیز موضوعات کے تعلق سے بھی حلقۂ ارباب ذوق کا رجحان الگ رہا، ترقی پسندوں کی طرف سے حلقہ کے شاعروں پر جنس پرستی کا الزام عائد کیا گیا اور یہ بھی کہ وہ سماجی موضوعات کو رد کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں کیونکہ میراجی، صدیقی، قیوم نظر، ضیا جالندھری اور خاص طور پر راشد کے ہاں سماجی اور سیاسی حالات کو نہایت اہتمام کے ساتھ موضوع بنایا گیا اور اس حد تک کہ سیاسی اور سماجی موضوعات سے بے توجہی کا الزام یکسر رد ہو جاتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ حلقہ ارباب ذوق کے شاعروں کے یہاں انفعالی کیفیات ملتی ہیں۔ ہیئت، موضوعات اور اظہار و اسالیب کے ضمن میں انھوں نے بعض منفی صورتوں سے کام لیا لیکن انتہا پسند ترقی پسندوں نے جیسا کہ حلقہ کے شاعروں کو بدنام کرنے کی سعی کی یہ کوئی مستحسن اقدام نہیں تھا۔ اردو شاعری کو نئے افق سے روشناس کرانے، نئی جہات سے آشنا کرانے، نئی راہوں پر گامزن کرنے اور نئی بلندیوں کی سمت رواں کرنے میں حلقۂ ارباب ذوق کا رویہ بھی ممتاز، نمایاں اور اہم ہے۔ اردو شعر و ادب میں اور کئی تحریکات، نظریات اور میلانات کی طرح حلقہ اربابِ ذوق کی اہمیت بھی لائق ذکر ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں حلقہ کے نام اور کام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہی نہیں بعد ازاں بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں جدیدیت وغیرہ کے جو رجحانات منظر عام پر آئے ان کی ساخت و پرداخت میں بھی حلقہ اربابِ ذوق کے رجحانات اور شعری سرمایہ کا گراں قدر حصہ ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

1. ترقی پسند تحریک کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔
2. ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے مابین فرق تحریر کیجیے۔
3. حلقہ اربابِ ذوق کے اہم رجحانات تحریر کیجیے۔

28.4 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے آپ کو حلقۂ اربابِ ذوق کے بارے میں بتایا۔ حلقۂ اربابِ ذوق کے قیام کے پس منظر اور قیام کے بارے میں آپ نے واقفیت حاصل کی۔ حلقہ اربابِ ذوق کا قیام 29 اپریل 1939ء کو لاہور میں عمل میں آیا بعد ازاں دھیرے دھیرے دہلی میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوئی اور شمالی ہند کے کئی علاقوں میں اس کو وسعت حاصل ہوئی۔ حلقے نے صرف ادبی اجتماعات ہی منعقد نہیں کیے بلکہ عملی طور پر شعر و ادب کے فروغ کے لیے بھی کام کیا۔ آپ کے علم میں بات بھی آئی کہ حلقہ نے کس طرح اپنے اجلاسوں کا انعقاد کیا اور پھر کس طرح اختلافات کے باعث حلقہ زوال کی سمت رواں ہوا۔ ایک کی بجائے تین حلقے منظر عام پر آئے۔ اور اب بھی برائے نام حلقہ اربابِ ذوق کا وجود ہے۔ ہم نے حلقہ کے ادبی رجحانات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا اور بتایا کہ حلقہ کے فن کاروں کے نزدیک اچھا ادب وہ ہے جو اپنے ماحول کا عکاس و ترجمان بھی ہو اور جس میں روایات کی پاس داری بھی موجود ہو۔ ادبی تخلیقات میں شدید احساسات اور انفرادی یا ذاتی تجربات کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگی لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ فن بہر حال فن رہے صحافت نہ بن جائے۔

حلقہ نے ہیئت اور داخلیت پر زیادہ زور دیا لیکن سیاسی اور سماجی حالات سے بھی حلقہ کے شاعر بیگانہ نہیں رہے انھوں نے سیاسی، تہذیبی اور سماجی موضوعات پر اظہار خیال کیا اور اپنے زاویے کو کام میں لے آئے۔ آپ نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ حلقہ اربابِ ذوق کی مجموعی طور پر ہماری ادبی تاریخ میں بڑی اہمیت ہے۔ آپ نے اپنی معلومات کی جانچ بھی کی۔ آخر میں امتحانی سوالات بھی دیے گئے ہیں اور فرہنگ کے تحت مشکل الفاظ کے معنی بھی ہیں۔ سفارش کردہ کتابوں کی فہرست بھی دی جا رہی ہے کہ آپ اس موضوع پر اپنے مطالعہ کو اور آگے بڑھائیں۔

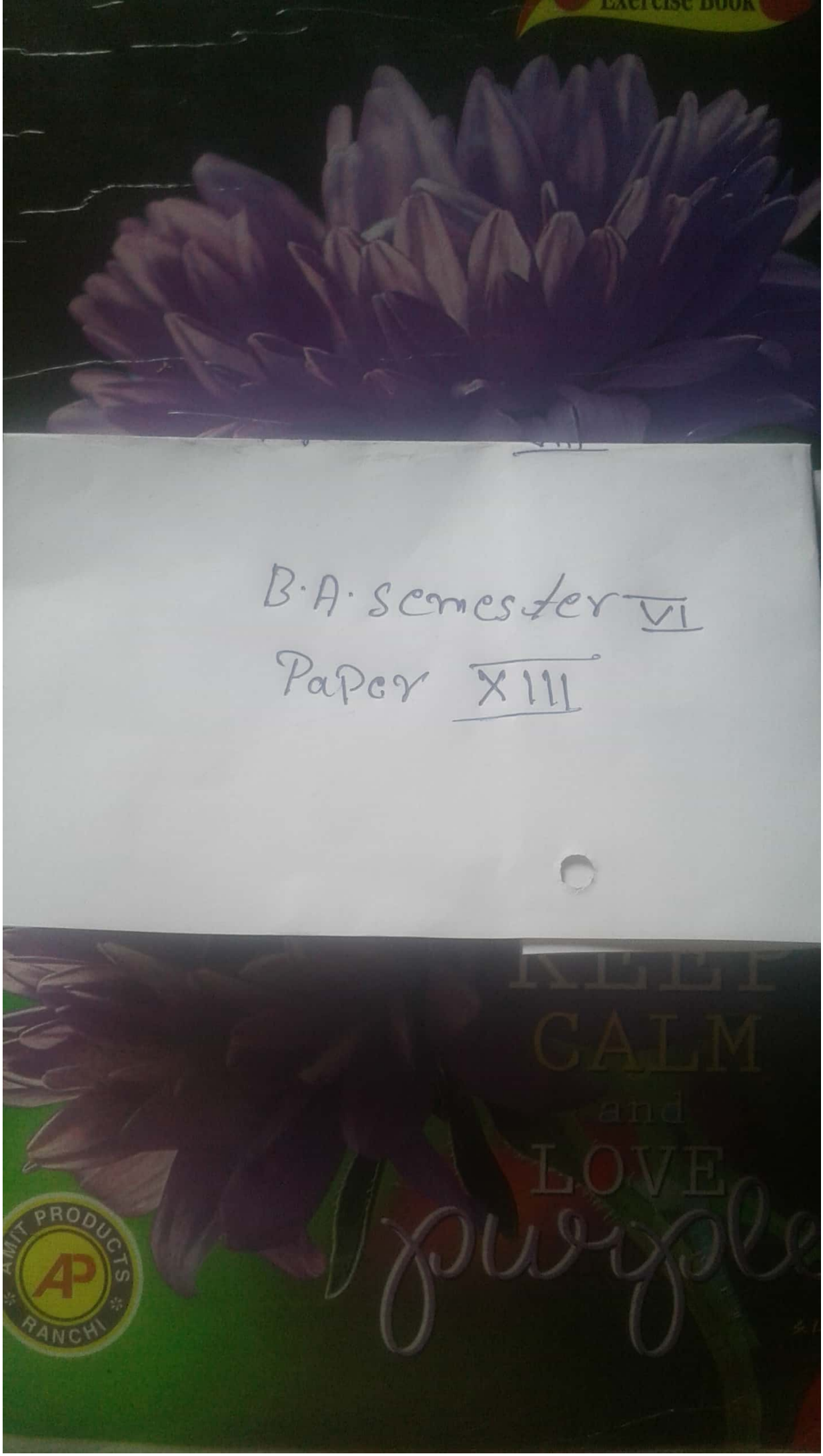

Scanned with CamScanner